یادگار سفر

محمد مظہر بقا

فاضلِ دیوبند ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی



بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز

کراچی


بسم الله الرحمن الرحيم

یادگار سفر

محمد مظہر بقا

فاضل دیوبند، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی



بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز

کراچی

ضابطہ

ناشر	:	بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی
طباعت	:	خالد پرنٹرز، اردو بازار، کراچی۔ ۷۴۲۰۰
کتابت	:	بقا کمپوزنگ سروسز، اردو بازار، کراچی۔ ۷۴۲۰۰
اشاعت	:	جو[illegible] ۱۹۹۹ء
قیمت	:	[illegible]۰ [illegible]پے

ملنے کا پتہ



بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز

اے۔ ۷، پہلی منزل، ہاشمی ٹرسٹ بلڈنگ

اردو بازار، کراچی۔ ۷۴۲۰۰

فون: ۲۶۳۳۶۷۵

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

اپنی زندگی کے گذشتہ ساٹھ سالہ دور کا تصور کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آغازِ شباب ہی سے سیر و سیاحت کا شوق گویا میرے خمیر کا ایک جزء ہے۔

عالمِ تجرد میں اندرونِ ہند جو سفر کئے ان کا مختصر حال میں اپنی کتاب "حیاتِ بقا" میں لکھ چکا ہوں۔ شادی ہوئی تو حُسنِ اتفاق کہ رفیقہ حیات بھی ایسی ملیں جو سفر کی خوگر تھیں۔ ان کے والد مرحوم نے پردہ ہونے سے پہلے تک ہر تفریحی سفر میں انہیں اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ان کی رفاقت نے میرے ذوقِ سفر کے لئے مہمیز کا کام کیا۔

۱۹۷۸ء میں جب خوش نصیبی سے سعودی عربیہ کی جامعۂ اُم القریٰ میں ملازمت کا موقع ملا اور آمدنی کی فراوانی ہوئی تو سالانہ تعطیلات میں بکثرت تفریحی سفر کا پروگرام بنا۔

آئندہ اوراق میں ان سفروں کی روئداد ہی پیش کر رہا ہوں۔

میں نے چاہا تھا کہ اس سفر نامے میں، میں نے جن مشہور شخصیات کا ذکر کیا ہے، ان کا مختصر تعارف اور جو مقامات دیکھے ان کی مختصر تاریخ بھی لکھ دوں، لیکن جب ایک صاحبِ علم سے اس کا ذکر آیا تو موصوف نے فرمایا کہ تعارف و تاریخ لکھنے کے لئے سفر کی کیا ضرورت ہے، انسائیکلوپیڈیا سامنے رکھو اور گھر بیٹھے جس کے چاہو حالات لکھ دو۔ سفر نامے میں تو ان چیزوں کا ذکر ہونا چاہئے جو آپ نے بچشم خود دیکھیں۔

جب کتاب مکمل کر چکا تو دوبارہ خیال آیا کہ مختصر تعارف و تاریخ بھی اسی کتاب میں لکھنا چاہئے، کسے میسر ہے اور کسے اتنی فرصت ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کھولے اور حالات دیکھے۔

لیکن یہ خیال ایسے وقت میں آیا جب نظریں اس اضافی کام کی متحمل نہیں رہیں، اس لئے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے اسی پر اکتفاء کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

سفروں کا سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔ ہمت ساتھ دے، صحت متحمل رہے اور اللہ کو منظور ہو تو کم از کم ایک بار امریکہ اور کینیڈا کا سفر کرنا ہے اور اقامہ ہونے کی وجہ سے ہر ششماہی پر حرمین شریفین کی زیارت کرنی ہے۔

لیکن اب جبکہ عمر ۷۶ سال سے تجاوز کر چکی ہے اور سفینۂ حیات لبِ ساحل آچکا ہے، ایک مختصر مگر آسان تر یا خدانخواستہ دشوار تر سفر ہر وقت ذہن پر مسلط رہتا ہے، وہ ہے سفرِ آخرت، جس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

افسوس یہ ہے کہ "پیری وصد آزار" کی وجہ سے موت سامنے نظر آرہی ہے لیکن اس کے لئے کوئی تیاری نہیں۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ آخر عمر میں بکثرت یہ دوہا پڑھ کر رویا کرتے تھے:

رنگالے چنریا بھگالے ری سیس
تُو کیا کیا کرے گی اری دن کے دِن
نہ جانے بُلا لے پیا کس گھڑی
کھڑی منہ تکے گی اری دِن کے دِن

جانتا ہوں کہ اگر بے زادِ راہ خالی ہاتھ یہ سفر پیش آیا تو انجام کیا ہوگا، اس کے باوجود جہاں تک اس کے لئے کماحقہٗ تیاری کا تعلق ہے یعنی طاعت و زھد، "پر طبیعت ادھر نہیں آتی"۔

میں نے اس سفر کو مختصر اس لئے کہا ہے کہ:

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سانس آگئی تو جہانِ فانی میں ہیں، نہ آئی تو جہانِ باقی میں پہنچ گئے۔

یہ سفر آسان تر یا دشوار تر اس لئے ہے کہ رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْقَبرُ رَوضَۃٌ مِن رِیَاضِ الْجَنَّۃِ أَوْ حُفرَۃٌ مِنْ حُفَرِ النَّار

(قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا)

اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ایمان پر خاتمہ فرمائے، اور عالمِ آخرت کی پہلی برزخی منزل کو ایک باغ بنادے کہ اسی کی آخری منزل جنت ہے۔ آمین۔

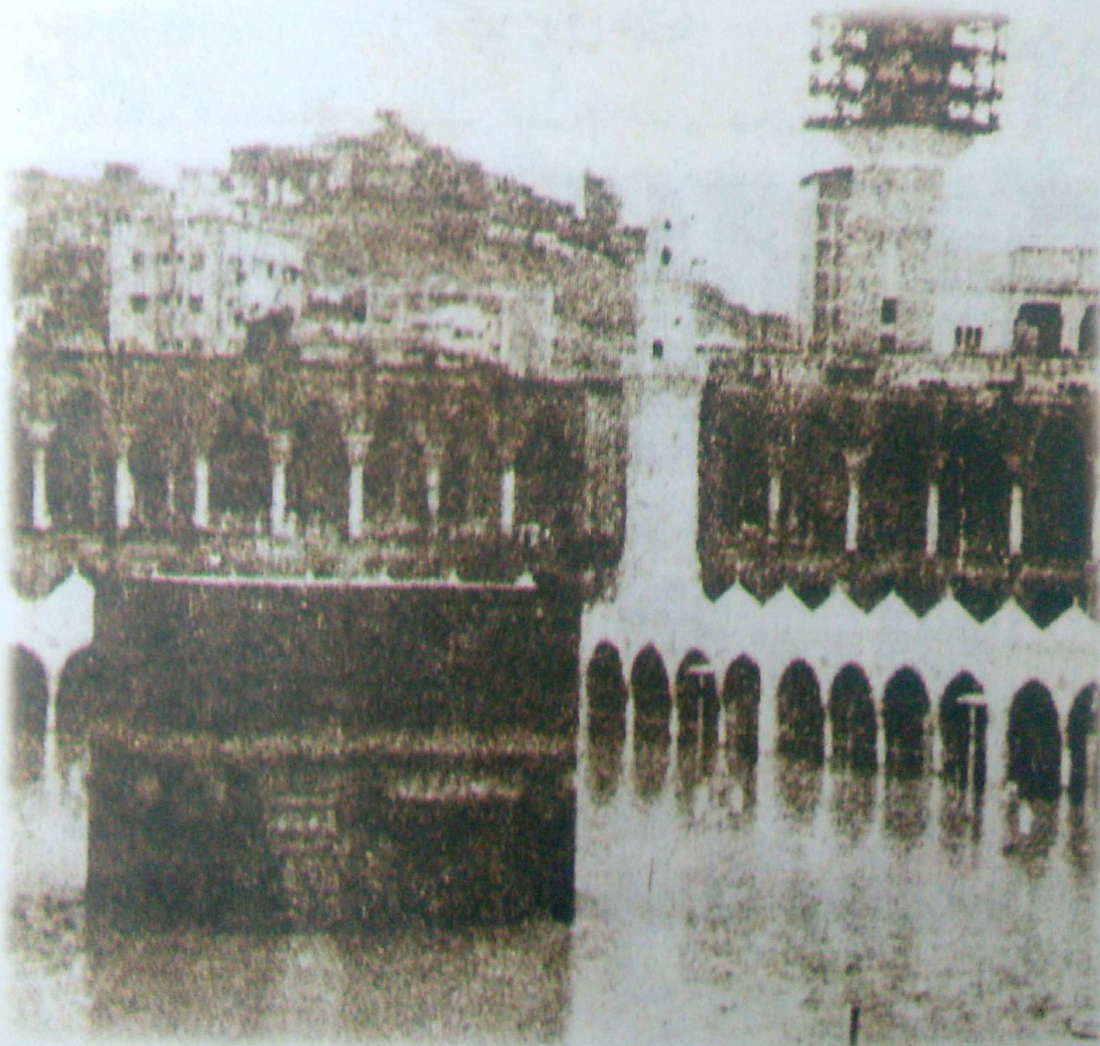
وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِین

محمد مظہر بقا

۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۸ء



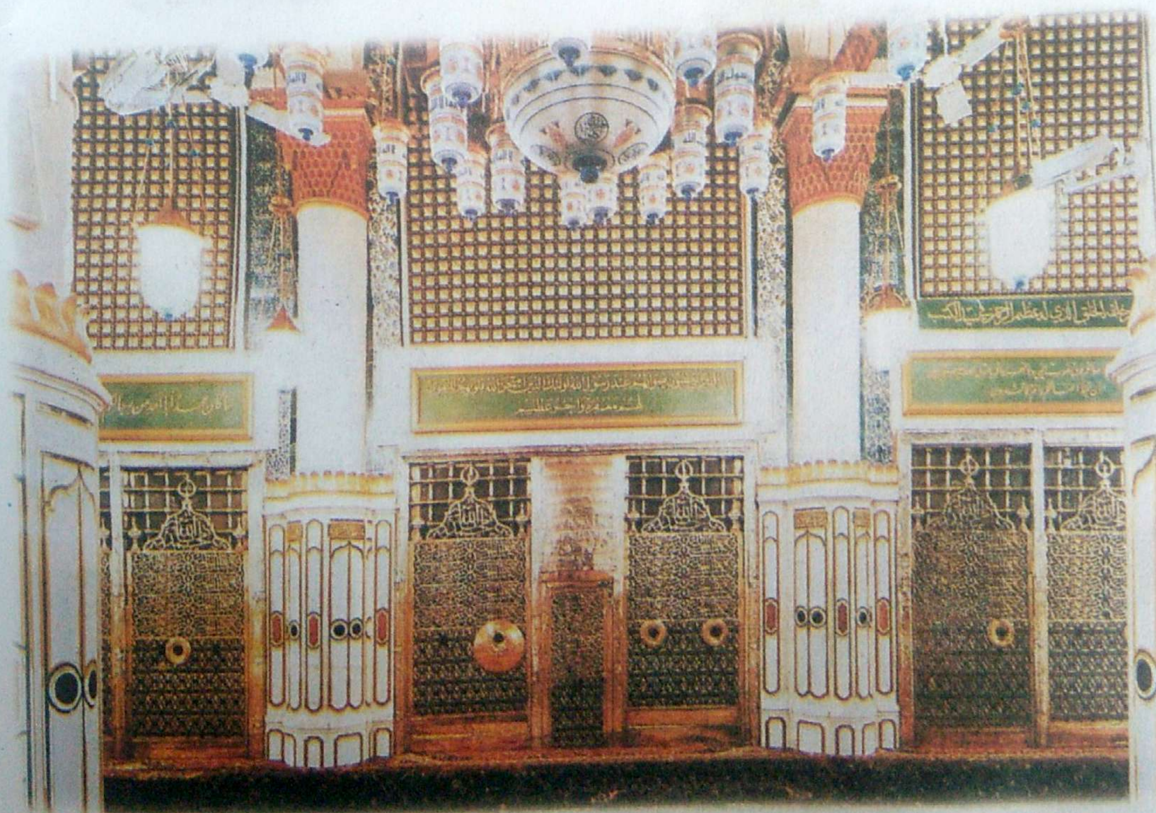
خانۂ کعبہ جدید



خانۂ کعبہ، مطاف خالی پانی کی وجہ سے



مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم



مواجهه شریف

مکہ ومدینہ حرسہما اللہ تعالیٰ

میں صفر ۱۳۹۸ھ = فروری ۱۹۷۸ء میں یونیورسٹی میں ملازمت کے سلسلے میں مکہ مکرمہ پہنچا اور آج جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں ربیع الاول ۱۴۱۷ھ = اگست ۱۹۹۶ء ہے۔

سعودی مملکت میں یوں تو ہمیشہ اصلاح و تعمیر کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن اس عرصے میں حرمین شریفین میں جن کے ساتھ ساری دنیا کے مسلمانوں کے دل وابستہ رہتے ہیں، تعمیر کا حسبِ ذیل کام ہوا:

خانۂ کعبہ کی مشرقی سمت میں صفا و مروہ کے باہر کے سارے مکانات اور دکانیں توڑ کر حاجیوں کے لئے وسیع میدان بنا دیا گیا اور اس میں سنگ مرمر کا فرش لگا دیا گیا۔ جبل ابو قبیس کے مکانات منہدم کر کے ان کی جگہ شاہی محلات بنائے گئے۔

سعودی حکومت جو مکان بھی منہدم کرتی ہے اس کا اتنا گراں قدر معاوضہ دیتی ہے کہ بعض لوگ تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کا مکان منہدم کر دیا جائے۔

خانۂ کعبہ کی مغربی سمت میں "سوق الصغیر" کو منہدم کر کے اس کے کچھ حصے میں حرم شریف کی توسیع ہوئی جو ایئر کنڈیشنڈ ہے اور باقی حصے میں وسیع میدان بنا دیا گیا اور اس میں سنگِ مرمر کا فرش لگا دیا گیا۔ بابِ ملک عبد العزیز اور بابِ ملک فہد کے درمیان میدان کے بعد جو شاندار عمارت ہے وہ بھی اسی زمانے میں تعمیر ہوئی۔

اسی عرصے میں ایک مرتبہ چاہِ زمزم کی صفائی کی گئی۔ جیاد کی سمت سے شامیہ کی سمت تک چاہِ زمزم کے مشرقی حصے کی، ترکی برآمدے تک، کھدائی کی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس

پورے حصے سے پانی بہہ بہہ کر زمزم کی طرف آرہا تھا۔ سب سے زیادہ پانی جیاد کی سمت سے آرہا تھا، اس کے بعد شامیہ کی طرف سے۔ جیاد کی سمت سے پانی ایک پختہ نالی میں سے آرہا تھا جو نہ معلوم کب بنائی گئی اور مٹی کے نیچے دب گئی تھی۔ یہ سارا پانی اس وسیع گڑھے میں جمع ہو رہا تھا جو کھدائی کے نتیجے میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس چھوٹے تالاب نما گڑھے سے موٹے موٹے پائپوں کے ذریعہ پانی باہر پھینکا جارہا تھا، پھر بھی ٹوٹتا نہ تھا۔

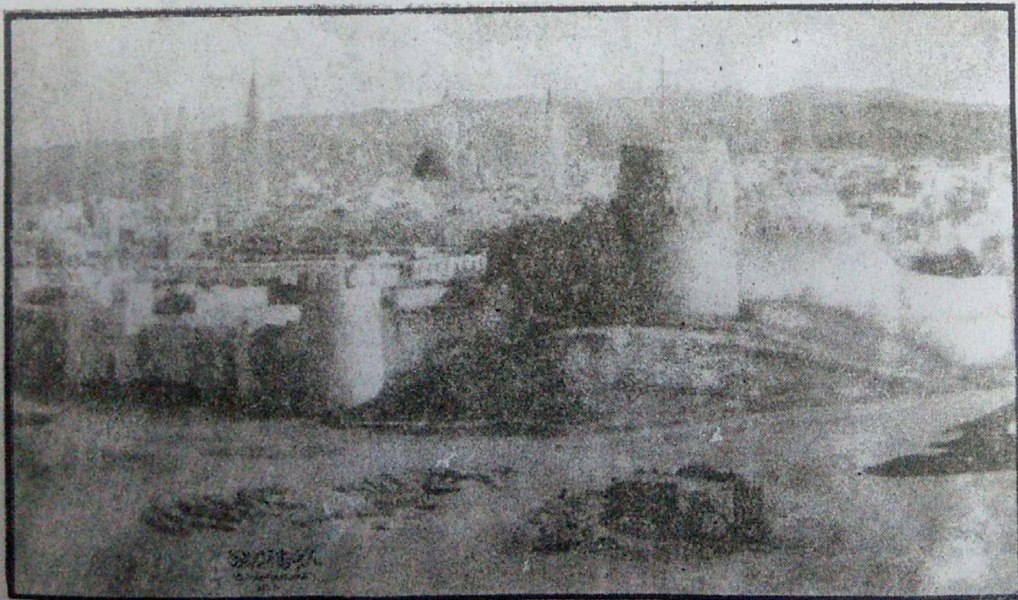
مجھے بتایا گیا کہ یہ پانی زمزم کا پانی نہیں۔ زمزم کا پانی دراصل وہ ہے جو کنویں کے اندر ہی سے چٹانوں میں سے آبشار کی شکل میں آرہا ہے یا نیچے کی چٹانوں سے اُبل رہا ہے۔ سب سے زیادہ پانی خانۂ کعبہ کے نیچے سے آرہا ہے اور کنویں میں آبشار کی صورت میں گر رہا ہے۔

اسی عرصے میں مطاف کو ترکی بر آمدے تک وسیع کیا گیا۔ اسی عرصے میں مسجدِ عائشہ، (عرفات کی) مسجدِ نمرہ اور (منیٰ کی) مسجدِ خیف میں توسیع ہوئی۔ اسی عرصے میں جدہ، مکہ اور مکہ۔ مدینہ کی نئی دورویہ سڑک بنی۔

اسی عرصے میں مسجدِ نبویؐ کی توسیع و تزین کا کام ہوا۔ وسیع علاقے کو حرمِ نبوی میں شامل کر لیا گیا۔ یہ جدید حصہ ایئر کنڈیشنڈ اور بہت خوبصورت ہے۔

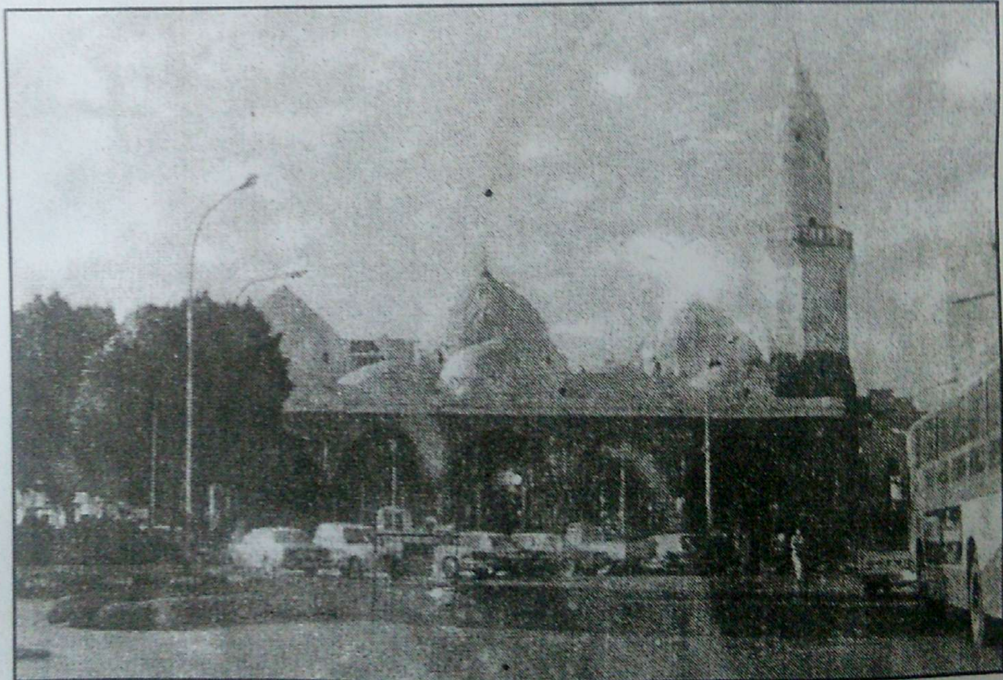
ملک فہد سلمہ اللہ نے حرمین شریفین کی توسیع کا جو کام کیا ہے، شاید آئندہ پچاس سال تک بھی اس میں اضافے کی گنجائش نہ ہو۔

مدینہ منورہ، قدیم

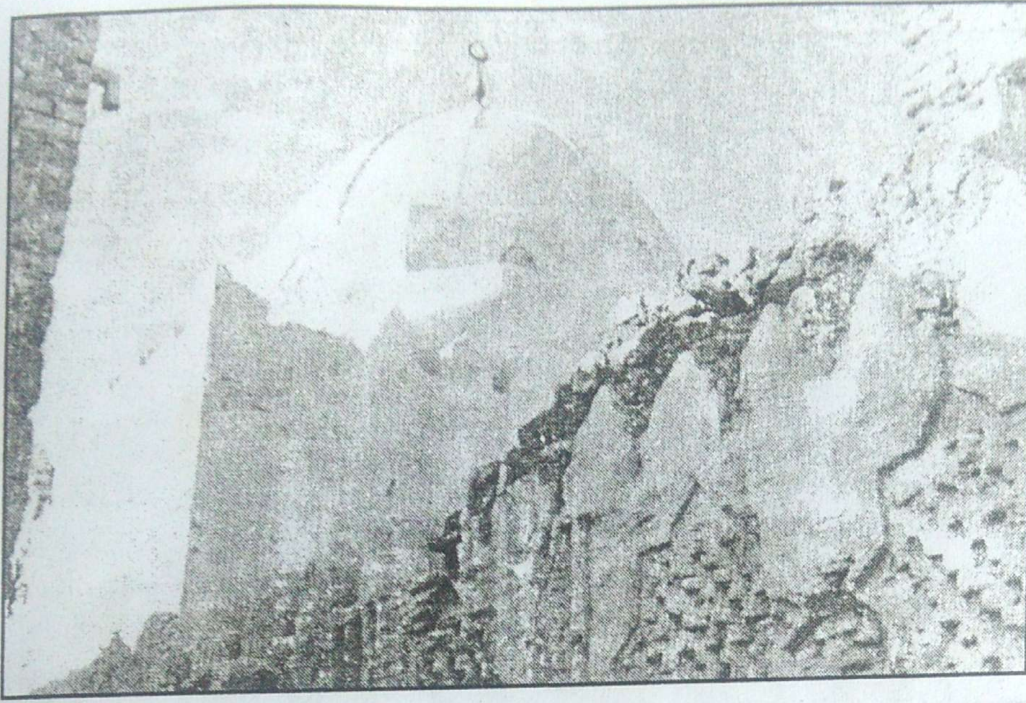




مدینہ منورہ، مسجدِ قبا (جدید توسیع سے پہلے)



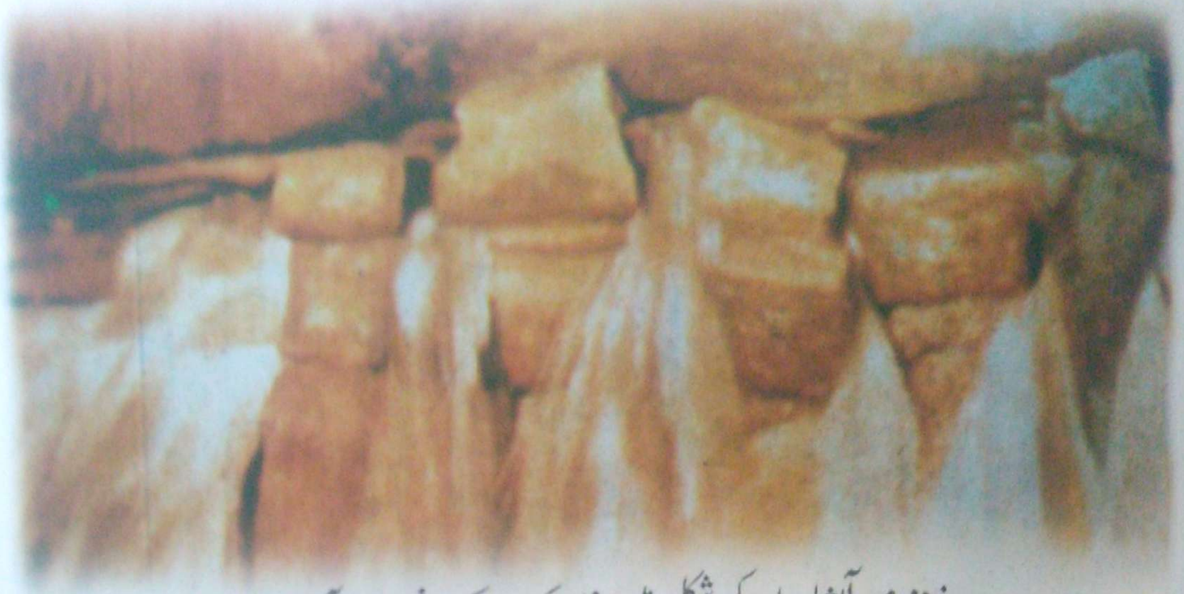
مدینہ منورہ، مسجدِ غمامہ



مدینہ منورہ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مکان (جواب موجود نہیں)



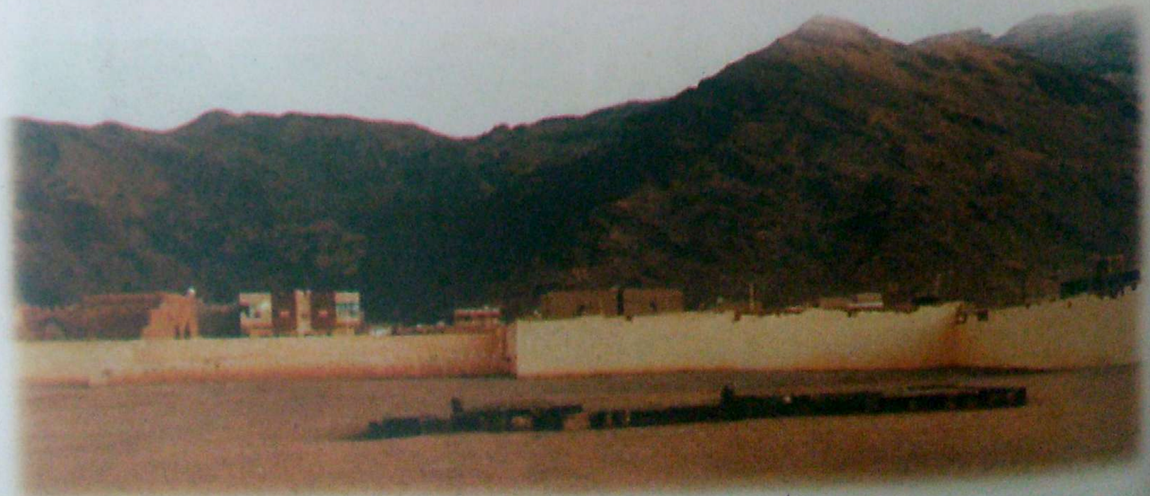
مدینہ منورہ، جبل احد، غار جس میں حضور ﷺ نے پناہ لی تھی



زمزم، آبشاروں کی شکل میں خانۂ کعبہ کے نیچے سے آتا ہوا



غارِ ثور



جبل احد، حضرت حمزہؓ اور شہدائے احد



خیبر کا قلعہ



مدائنِ صالح، قد آدم سے اونچا وہ پیالہ جس میں حضرت صالحؑ کی اونٹنی کا دودھ جمع کیا جاتا تھا

خیبر اور مدائنِ صالح

۱۹۸۴ء میں ایک مرتبہ موسمِ سرما کی تعطیلات میں اہلیہ اور اپنی بیٹی ساجدہ کے ساتھ ایک ہفتہ کے قیام کے لئے مدینہ منورہ گیا۔ وہاں سے قاری عبداللطیف صاحب کی معیت میں مدائن صالح جانے کا پروگرام بن گیا۔ چنانچہ فجر کی نماز سے قبل اپنی گاڑی سے روانہ ہوئے اور رات کو تقریباً بارہ بجے واپس آئے۔

مدینہ منورہ سے مدائن صالح کا فاصلہ تقریباً ساڑھے سات سو کلو میٹر ہے۔ راستے میں خیبر کا قلعہ بھی دیکھا۔ سب سے پہلے اس مقام کی زیارت کی جہاں فتح خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ اس مقام کو چھوٹے پتھروں سے گھیر دیا گیا ہے۔ پھر خیبر کا قلعہ دیکھنے کے لئے چڑھے۔ قلعے کی فصیل اگرچہ سالم ہے لیکن اندر کی بیشتر عمارتیں شکستہ ہیں۔

قلعے سے نیچے ایک وسیع بوسیدہ مسجد ہے اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک چشمہ ہے جس سے پانی بہہ رہا تھا اور اس میں ایک پتھر ہے جس میں اس طرح کا شگاف ہے جیسے تلوار کی ضرب سے یہ شگاف پڑا ہو۔ قاری عبداللطیف صاحب نے بتایا کہ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ صاحبِ قلعہ اور مشہور پہلوان "مرحب" سے قلعے کے اوپر سے جنگ کرتے ہوئے حضرت علیؓ یہاں تک پہنچے تھے اور یہاں انہوں نے تلوار کی ایسی ضرب لگائی تھی جو "مرحب" کو کاٹتی ہوئی اس پتھر پر پڑی تھی اور اس سے پانی جاری ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

قلعے سے نیچے چھوٹے سے رقبے میں کھجوروں کا ایک باغ بھی ہے جس کے بارے میں

معلوم ہوا کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے نام سے ہر شخص کے لئے وقف ہے۔

خیبر سے فارغ ہو کر مدائن صالح کے لئے روانہ ہوئے۔ "العلا" پہنچنے سے پہلے دونوں جانب پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرخی مائل پتھروں کے یہ خوبصورت پہاڑ ایسے تھے گویا دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔

"العلا" پہنچ کر گورنر کے دفتر سے مدائن صالح جانے کی اجازت لی، اس کے بعد آگے روانہ ہوئے۔ مدائن صالح کی حدود شروع ہونے سے پہلے ہمیں بتایا گیا کہ یہاں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ مدائن صالح پہنچ کر سب سے پہلے متوسط بلندی کی ایک پہاڑی سامنے آئی۔ یہ پہاڑی دراصل صرف ایک چٹان ہے جس کے اطراف کو تراش کر اس میں کہیں یک منزلہ اور کہیں دو منزلہ مکانات یا کمرے بنائے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں وتنحتون من الجبال بیوتا فارھین میں انہی مکانات کا ذکر ہے۔

یہ مکانات آج بھی اس حالت میں ہیں جیسے ابھی بنائے گئے ہوں۔ میں ان مکانات کا فوٹو لے رہا تھا کہ وہاں کے محافظ آگئے اور فوٹو لینے سے نہ صرف منع کر دیا بلکہ کیمرے سے وہ ریل بھی نکال دی جس میں چند فوٹو لئے جا چکے تھے۔

اس کے بعد وہ پیالہ دیکھا جس میں اونٹنی کا دودھ جمع کیا جاتا تھا۔ حضرت صالحؑ کی دعا سے معجزے کے طور پر جو اونٹنی اپنے بچے کے ساتھ پہاڑ سے نکلی تھی، پہلے تو وہ ہر گھر کے دروازے پر پہنچ کر کھڑی ہو جایا کرتی تھی اور صاحبِ خانہ اپنی ضرورت کے مطابق دودھ دوہ لیا کرتا تھا۔ پھر قوم کے فیصلے سے ایک پیالہ بنایا گیا کہ دودھ دوہ کر اس میں جمع کر دیا جائے اور اس میں سے ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق لے جائے۔ یہ پیالہ ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ اس کی بلندی چھ فٹ سے زیادہ اور قطر تقریباً دو میٹر ہے۔

وہاں سے واپس ہوئے تو گاڑی ریت میں پھنس گئی۔ بڑی مشکل سے نکالا۔ آگے بڑھے تو محافظ پھر مل گئے۔ ہم نے انہیں گاڑی پھنسنے کا حال سنایا تو شاید انہوں نے عورتوں پر ترس کھا کر کہا کہ اپنی گاڑی یہیں چھوڑ کر ہماری یُونیٹ (پِک اَپ) میں بیٹھ جاؤ کیونکہ آگے

ریت اور بھی زیادہ ہے اور تمہاری گاڑی اس ریت میں نہیں چل سکتی۔ محافظوں نے ہمیں ان کا دربارِ عام دکھایا۔ دو بلند پہاڑوں کی چوٹیاں باہم بالکل قریب آگئی ہیں اور ان کے سائے میں پتھروں کو تراش کر خوبصورت دربارِ عام بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد ہم محافظوں کے ساتھ اس تاریخی کنویں پر گئے جس کا سارا پانی ایک روز اونٹنی پی جاتی تھی اور دوسرے روز قوم کے جانور پیتے تھے اور اسی سے تنگ آکر "قدار بن سالف" نے اونٹنی کی کوچیں کاٹ دی تھیں، جس کے نتیجے میں پوری قوم اللہ کے عذاب سے تباہ ہوگئی۔ اس وسیع و عریض کنویں میں اب تک پانی موجود تھا۔

ہم نے محافظوں سے وہ پہاڑ دکھانے کی فرمائش کی جس سے اونٹنی نکلی تھی۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ پہاڑ اگرچہ سامنے نظر آرہا ہے لیکن مسافت بہت ہے اور ریت بھی وہاں اس کثرت سے ہے کہ اس میں یہ اُنیٹ بھی نہیں چل سکتی۔ پھر انہوں نے ہمیں ہماری گاڑی تک پہنچادیا۔

مدائن صالح میں اب بھی تھوڑی سی آبادی ہے۔ اس میں سرکاری ڈسپنسری بھی ہے، جس میں ایک پاکستانی ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔

مصر

۲۴ر جون ۱۹۸۵ء کو میں اپنی اہلیہ اور اپنی بچی ساجدہ کے ساتھ قاہرہ پہنچا اور زندگی میں پہلی بار ان فراعنہ کی سرزمین پر قدم رکھا جن کی عظمت کے آثار اب تک اہرام کی شکل میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمجید قطامش اور استاذ نعیم محمد شلتوت کو فون پر مطلع کر دیا تھا، چناں چہ دونوں حضرات اپنی اپنی گاڑیاں لیے ایئرپورٹ پر موجود تھے اور ہر ایک نے اپنے ساتھ قیام پر اصرار کیا۔ میں نے شلتوت صاحب کے اس تین کمروں والے مستقل فلیٹ میں قیام کو ترجیح دی جس کے پیچھے خوبصورت باغیچہ بھی تھا۔ یہ فلیٹ خالی پڑا تھا، جسے شلتوت صاحب نے ہمارے لیے صاف کرا دیا تھا۔ یہ فلیٹ قاہرہ کے ایک خوبصورت مضافاتی محلہ "معادی" میں واقع تھا۔ انگریزوں کے دور میں انگریزوں کے سوا کسی اور کو اس محلہ میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔

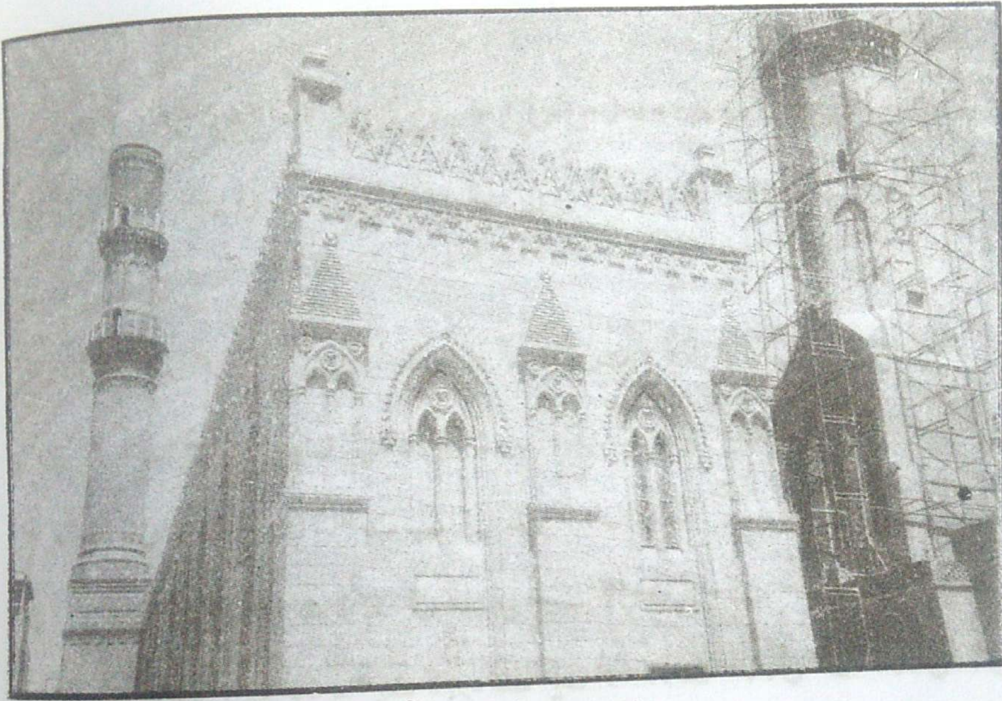
شلتوت صاحب مجھے لے کر بازار گئے۔ ایک مشہور دوکان سے ہمارے لیے اتنے کباب خریدے کہ ہم سے دو دن میں ختم ہوئے۔ پھل بھی اتنے خریدے کہ ایک ہفتہ چلے، پھر بھی ایک تربوز خراب ہونے کی وجہ سے پھینکنا پڑا۔

عرب خواہ کہیں کا ہو، مہمان نوازی اس کا نمایاں وصف ہے۔ ڈاکٹر قطامش، استاذ شلتوت اور استاذ عبدالکریم عزباوی نے کئی کئی بار گھر پر اور نیل کے کنارے دعوتیں کیں۔ یہ سب حضرات مکہ مکرمہ کی جامعہ ام القریٰ میں میرے رفقائے کار میں سے ہیں۔ ایسے

اجتماعات میں بیوی تو دوسری عورتوں کا منہ تکتی رہتیں، ساجدہ ہی سب سے بے تکلف باتیں کرتی تھی، کیوں کہ وہ تین سال مکہ مکرمہ میں مصری استانیوں سے پڑھ چکی تھی۔

۲۵/ جون ۱۹۸۵ء

شام کو ڈاکٹر قطامش کے ساتھ ان کی بیٹی (نہاد) کی گاڑی میں جا کر جامع ازہر اور مسجد سیدنا حسینؓ کی زیارت کی۔



مصر، قاہرہ، مسجد سیدنا حسینؓ

مسجد سیدنا حسین کے قبلہ کی سمت میں ایک حجرہ ہے جس میں سیدنا حسینؓ کا سر مبارک مدفون ہے۔ استاد شلتوت نے جو تاریخ کے پروفیسر ہیں، کہا کہ سیدنا حسینؓ کا سر مبارک یہاں پہنچنا تاریخی حقیقت ہے۔ پہلے یہ سر شام میں دفن ہوا اور وہاں سے سرکاری اعزاز کے ساتھ یہاں لا کر دفن کیا گیا۔ لیکن دوسرے حضرات کو اس میں شک ہے۔ انہیں میں سے علامہ ابن تیمیہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے فتاویٰ میں اس پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس شک کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ میرے علم کی حد تک شیعہ اسے تسلیم نہیں کرتے، ورنہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس جگہ ان کا تسلط نہ ہو اور ہر وقت شیعہ زائرین کا ہجوم نہ رہے۔ واللہ اعلم۔

اسی مدفن کے قریب ایک اور حجرہ ہے جس میں، جیسا کہ معلوم ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور دوسرے تبرکات ہیں۔ چوں کہ حجرے کی مرمت ہو رہی تھی اور تبرکات کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا، اس لیے ہم ان کی زیارت نہ کر سکے۔

واپسی پر حلیمہ جدیدہ سے گذرے جہاں اخوان المسلمین کا مرکزی دفتر ہے۔ اس میں اخوان کے بانی حسن البناء کو شہید کیا گیا تھا۔

۲۶ر جون

عشاء کی نماز امام شافعیؒ کی مسجد میں پڑھی، جس کے ایک جانب ان کی قبر ہے اور اس پر گنبد بھی بنا ہوا ہے جو دور سے نظر آتا ہے۔ وتر پڑھے تو جی نہ چاہا کہ جوار تو ہو امام شافعیؒ کا اور وتر ہوں حنفی مسلک کے مطابق، چناں چہ دو رکعت پر سلام پھیرا اور تیسری رکعت مستقل تحریمہ و سلام کے ساتھ پڑھی۔

امام شافعیؒ نے بھی بغداد میں جب امام ابو حنیفہؒ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی تھی تو دعائے قنوت ترک کر دی تھی (حالانکہ فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا امام شافعیؒ کے نزدیک واجب ہے) اور جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اپنے اجتہاد کے خلاف کیوں کیا؟ تو جواب دیا تھا: مجھے شرم آئی کہ ابو حنیفہؒ کے جوار میں نماز پڑھوں اور ان کے اجتہاد کے خلاف اپنے اجتہاد پر عمل کروں۔

امام شافعیؒ کے مزار کے احاطے میں دوسری قبروں کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت زکریا انصاریؒ کی قبر بھی ہے۔

فقیہ مصر امام لیثؒ ابن سعد کا مزار بھی دیکھا۔ یہ امام مالکؒ کے ہم عصر ہیں۔ امام شافعیؒ کو بھی تمنا تھی کہ انھیں ان کی شاگردی نصیب ہو، لیکن امام شافعیؒ جب مصر پہنچے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ائمۂ اربعہ کو جیسے شاگرد نصیب ہوئے ویسے شاگرد امام لیثؒ کو میسر نہ آ سکے جو ان کے مذہب کی اشاعت کرتے، ورنہ ائمۂ اربعہ کی طرح ان کا مذہب بھی جداگانہ مدون ہوتا۔

احمد حسین اجمیری میرے کراچی یونیورسٹی کے شاگرد ہیں اور ان دنوں پی ایچ ڈی کے سلسلے میں برسوں سے قاہرہ میں مقیم ہیں۔ ملازمت بھی کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ہمراہ اپنی موٹر سائیکل پر مصر کے مشہور مجذوب حضرت ذوالنون مصریؒ کا مزار دکھانے کے لیے لے گئے۔ دریافت کرتے کرتے بڑی مشکل سے وہاں تک پہنچے۔ مسجد کے ایک جانب تین حضرات مدفون ہیں؛ حضرت رابعہ عدویہؒ، حضرت ذوالنون مصریؒ اور حضرت محمد بن الحنفیہؒ۔ بعد میں جب میں نے استاد فہیم شلتوت سے ذکر کیا تو موصوف نے فرمایا کہ تاریخ سے یہ ثابت ہی نہیں کہ محمد بن الحنفیہؒ کا انتقال مصر میں ہوا ہو۔ واللہ اعلم۔

جاتے ہوئے حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کا خستہ مزار بھی دیکھا۔



مصر، قاہرہ، رابعہ عدویہ

۲۷ر جون

آج اہرام دیکھنے گئے۔ فراعنۂ مصر کے یہ آثار آج بھی ان کی عظمت کی شہادت دینے کے لیے اسی طرح موجود ہیں، جیسے آج ہی بنائے گئے ہوں۔ اہراموں کے ساتھ ساتھ ابوالہول کا ایک سالم چٹان پر تراشا ہوا مجسمہ بھی دیکھا، جو مصریوں کی صناعی کا عجیب نمونہ ہے؛

جسم شیر کا ہے اور چہرہ عورت کا۔ رات کو اس مجسمے کے سامنے ایک شو بھی دیکھا۔ تاریکی کر کے مجسمے پر رنگا رنگ روشنیاں ڈالی جاتی ہیں اور آواز اس طرح گونجتی ہے جیسے ابوالہول بول رہا ہو۔ اس آواز کے ذریعے مختلف زبانوں میں گویا ابوالہول کی زبانی مصر کی قدیم تاریخ سنائی جاتی ہے۔

۲۸/ جون

آج بروز جمعہ محلہ شبرا کا رخ کیا اور اطلاع کے بغیر استاد محمد محمود شعبان کے مکان پر پہنچ گئے، جن کا پتہ مجھے معلوم تھا اور ان سے مراسلت بھی قائم تھی۔ شعبان صاحب سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب وہ جامع ازہر کے مبعوث کی حیثیت سے کراچی یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے شعبوں میں ایک سال کے لیے عربی ادب کی تدریس کے سلسلے میں بھیجے گئے تھے۔ ہمیں دفعتہً دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ جمعہ کے بعد کھانا کھایا، جس میں عربوں کی مہمان نوازی کی روایت قائم رکھتے ہوئے شعبان صاحب کی اہلیہ نے بڑا تکلف کیا۔ شعبان صاحب جیسے بزرگ آدمی نے دریافت کیا کہ عورتیں اور مرد ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے یا جُدا جُدا؟۔ میں نے کہا: جدا جدا۔ فرمایا: میں بھی اسی کو پسند کرتا ہوں، لیکن دریافت اس لیے کیا کہ اگر کھانا مخلوط نہ ہو تو مصر میں اسے مہمان کے اعزاز کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اعزاز کے مقابلے میں مجھے اپنی بے اعزازی ہی گوارا ہے۔ بعد میں بھی میں نے اپنی اس بے اعزازی کو ہر دعوت میں قائم رکھا۔

شعبان صاحب کے یہاں سے شام کو چھ بجے معادی واپس آئے اور آدھے گھنٹے بعد قطامش صاحب کے صاحبزادے "طارق" کی گاڑی میں پھر سیر کو نکل گئے۔

سب سے پہلے حضرت عمرو بن العاصؓ کی طویل و عریض مسجد دیکھی۔ سال کے ایام کی مناسبت سے اس کے ۳۶۰ ستون ہیں۔ سمتِ قبلہ کے بائیں جانب کے گوشے پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا مزار ہے۔ یہ مسجد مصر کی سب سے پہلی مسجد ہے۔



مصر، قاہرہ، مسجد عمرو بن العاصؓ، بیرونی منظر



مصر، قاہرہ، مسجد عمرو بن العاصؓ، مؤلف نماز پڑھتے ہوئے

وہاں سے روانہ ہو کر سیدہ نفیسہ بنت حسن الانور بن زیدؓ بن الحسن بن علی، سیدہ عاتکہ (حضورؐ کی پھوپھی)، سیدہ رقیہ اور سیدہ سکینہ بنت حسین کے مزارات پر گئے اور مسجد شیخون دیکھتے ہوئے دریائے نیل کے کنارے ایک کلب میں رات کا کھانا کھایا۔

۲۹/ جون

قاہرہ تو ایک تاریخی شہر ہے، یہاں کے چپے چپے پر قبطیوں، یونانیوں، رومیوں مسلمانوں اور دوسری اقوام کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ ۱۳ روز میں ہم کیا کیا دیکھتے۔ تاہم دو مقامات کے علاوہ باقی قریب قریب سارے اہم تاریخی مقامات دیکھ لیے۔ دو اہم مقامات جو نہ دیکھ سکے ان میں سے ایک تھا فراعنۂ مصر کا دار السلطنت لکسر، دوسرا اسوان ڈیم۔ اپنے ملک کا تربیلا ڈیم دیکھ چکا تھا، اس لیے اسوان ڈیم کا تو مجھے چنداں شوق نہ تھا، صرف چھوٹے اور بڑے ہی کا فرق ہو گا، البتہ لکسر دیکھنا چاہتا تھا، وہ بھی اس لیے نہیں کہ وہاں فراعنہ کی یادگاریں ہیں کیوں کہ یادگاریں قاہرہ کے میوزیم اور دوسرے مقامات پر دیکھ لی تھیں، صرف اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایام طفلی، زمانۂ شباب اور نبوت کے بعد سے بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلنے تک کا پورا زمانہ وہاں گذارا تھا۔ لیکن چوں کہ جبلِ موسیٰ (کوہِ طور) دیکھنے کی تمنا بھی تھی اور وقت میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ یہ تمام مقامات دیکھ سکتے، اس لیے یہی فیصلہ کیا کہ ”آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی“، اس لیے بھی کہ لکسر میں فراعنہ کی یادگاریں تو ہیں، حضرت موسیٰؑ کی کوئی یادگار نہیں اور وادیٔ مقدس اور جبلِ موسیٰ کو قیامت سے پہلے کون مٹا سکتا ہے۔

کوہِ طور جسے ”جبلِ موسیٰ“ کہا جاتا ہے قاہرہ سے چار سو آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ جگہ جہاں جبلِ موسیٰ واقع ہے ”سانت کاترین“ کہلاتی ہے۔

حکومت یا کسی ادارے کی خصوصی اجازت کے بغیر ایک نہایت آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ بس میں ہم قاہرہ سے سانت کاترین کے لیے صبح سات بجے روانہ ہوئے۔ استاد فہیم نے ہمیں بس اسٹاپ تک پہنچایا۔ دس مصری پونڈ فی کس ٹکٹ تھا۔ بس کہیں بحرِ احمر کے کنارے اور کہیں متوسط بلندی کے پہاڑی سلسلے کے درمیان گذرتی رہی۔ راستہ میں ”ابو رودیس“ کا علاقہ بھی آیا، جہاں سے پیٹرول نکلتا ہے اور ایسے مقامات بھی آئے کہ دائیں جانب نیلا سمندر ہے اور بائیں جانب بھورے، سیاہ اور سرخ پتھروں کا پہاڑی سلسلہ۔ پہاڑوں پر کافی بلندی تک پانی کے

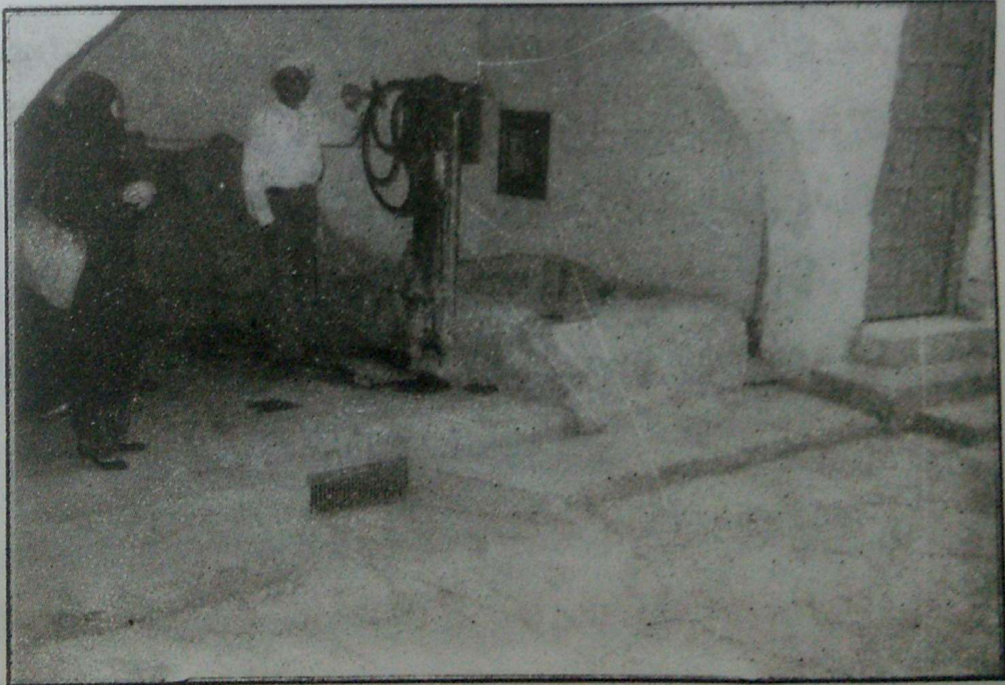
کٹاؤ کے اثرات نظر آرہے تھے۔ بس کے ٹی۔وی اسکرین پر ایک مصری ڈرامہ دکھایا جارہا تھا، اتنا عریاں کہ بعض مناظر پر نظریں جھک جاتی تھیں۔

تقریباً ایک بجے سانت کاترین پہنچے۔ بس کو چوں کہ آگے جانا تھا، اس لیے ہمیں "فندق الراحة" کے قریب سڑک پر اتار دیا گیا۔ یہاں سے سانت کاترین کی مختصر آبادی ایک جانب تھی اور دیر (گرجا) دوسری جانب۔ جہاں ہم اُترے تھے وہاں سے دونوں کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر تھا اور پہاڑوں کی وجہ سے نہ آبادی نظر آتی تھی، نہ دیر۔ بس سے اُتر کر جب ہم اپنے مختصر سامان کے ساتھ سڑک پر کھڑے ہوئے تو دلوں پر خوف مسلط ہو گیا۔ اجنبی ملک، سنسان مقام، ۶۴ سال کی عمر میں دو عورتوں کا ساتھ، جن میں ایک جوان بچی۔ بیوی زیادہ پریشان تھیں، لیکن کرتے کیا، بس آگے جا چکی تھی اور واپسی کے لیے ۲۴ گھنٹے سے پہلے کوئی بس نہ تھی۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش، سامان لے کر دیر کی جانب پیدل چل دیے۔ دو چار غیر ملکی سیاح بھی اسی طرف جارہے تھے۔ دیر پہنچ کر درختوں کے سائے میں دم لیا۔ یہاں خدام کی چند صورتیں نظر آئیں اور یہ معلوم ہونے پر کہ یہ مسلمان ہیں، مزید اطمینان ہوا۔

"فندق الراحة" گراں ہوٹل ہے، جس کا فی کس یومیہ کرایہ ۲۵ مصری پونڈ ہے۔ اس کے مقابلے میں دیر کی طرف سے زائرین کے لیے کمرے بنے ہوئے ہیں اور ہر کمرے کے نیچے اوپر ریل کے ڈبوں کی طرح برتھ بنے ہیں۔ یہاں ۵ پونڈ فی کس کے حساب سے کرایہ لیا جاتا ہے۔ یہ جگہ، اس کے کمرے، بستر اور تمام چیزیں صاف ستھری تھیں۔ ایک مشترک باورچی خانہ بھی تھا۔ کمروں میں سیاح بھی قیام پذیر تھے۔ رفتہ رفتہ ہماری وحشت کم ہوتی گئی اور اس وقت یہ وحشت بالکل ختم ہو گئی جب مصری فوج کا ایک کپتان اپنے اہل و عیال کے ساتھ اتفاقاً وہاں پہنچ گیا، یا اللہ تعالیٰ نے ہماری وحشت دور کرنے کے لیے اس کے ارادے کے بغیر اس کو وہاں پہنچادیا۔ کپتان تفریح کے لیے "شرم الشیخ" جارہا تھا، لیکن گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے اسے وہاں رکنا پڑا۔ اس نے اپنی گاڑی فوجی ورکشاپ میں درست ہونے کے لیے دی اور وہاں سے ایک فوجی جیپ لے کر رات بسر کرنے دیر آگیا۔ اس کی سالی بھی اس

کے ساتھ تھیں، جن سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ میرے ہی موضوع "اصولِ فقہ" میں پی ایچ۔ڈی ہیں اور ریاض کے کلیۃ البنات میں فقہ اور اصولِ فقہ کے شعبے کی صدر ہیں۔ ان سے اصولِ فقہ پر کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میری بچی ساجدہ اچھی طرح عربی بولتی اور سمجھتی ہے، وہ بھی کافی دیر تک عورتوں سے باتیں کرتی رہی۔ اس طرح بیوی اور بچی کی وحشت بالکل ختم ہوگئی۔

ہم سنیچر کو ایک بجے کے بعد دیر سانت کاترین پہنچے تھے۔ معلوم ہوا کہ دیر روزانہ بارہ بجے بند ہو جاتا ہے، چناں چہ آج بھی مقررہ وقت پر بند ہو گیا اور کل اتوار کو زائرین کے لیے بالکل بند رہے گا۔ ہمیں یہ سوچ کر کافی مایوسی ہوئی کہ یہاں مزید ایک رات قیام کرنا پڑے گا، کیوں کہ دیر کے اندرونی احاطے میں داخل ہوئے بغیر واپس آجانا ہمیں گوارا نہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسی احاطے کے اندر بیر موسیٰ (حضرت موسیٰ کا کنواں) ہے اور اسی احاطے میں "شجر موسیٰ" ہے، وہی جھاڑی جس سے حضرت موسیٰ کو اللہ رب العزت کی آواز سنائی دی تھی۔ دیر ہماری قیام گاہ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ میں مغرب سے ذرا قبل ٹہلتا ہوا اوپر کی طرف



مصر، کوہِ طور، بیر موسیٰ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کنواں)

چڑھا۔ وہاں کچھ خدام بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک شخص سے عربی میں دریافت کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس وقت دیر کی زیارت کر لیں؟ اس نے جواب دیا: میں دریافت کرتا ہوں۔ چناں چہ وہ اندر گیا اور یہ جواب لایا کہ دیر تو اس وقت نہیں کھولا جا سکتا البتہ اس کے احاطے میں واقع دوسری چیزوں کی زیارت کی جا سکتی ہے۔ چناں چہ خادم کے ساتھ ہم اندر داخل ہو گئے۔ خادم نے ہمیں بیر موسیٰ کا پانی پلایا۔ اس میں ہینڈ پمپ لگا ہوا ہے جسے ایک پہیئے سے گھمایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی دیوار سے لگا ہوا ایک بڑا وزنی پتھر رکھا ہوا تھا۔ خادم نے بتایا کہ یہ اس کنویں کا ڈھکن ہے۔ پانی بڑا سبک اور شیریں تھا۔ اس کے بعد خادم ہمیں مقدس جھاڑی کے پاس لے گیا۔ یہ بڑی سی جھاڑی ایک نیم دائرہ قد آدم دیوار کے اندر اُگی ہوئی ہے اور اب تک سبز ہے۔ دیوار پر آویزاں بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ اس کی کوئی چیز توڑنا منع ہے۔

تعجب ہے کہ تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل کی یہ جھاڑی اب تک سرسبز کس طرح ہے، لیکن کیا کہا جائے کہ نسلاً بعد نسل لوگ اس جھاڑی کو اسی طرح دیکھتے چلے آئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مدینہ منورہ کے اس باغ میں، جو حضرت سلمان فارسی کے باغ کے نام سے مشہور ہے، ۱۹۷۰ء۔۷۱ء میں نے بچشم خود کھجور کے وہ دو درخت دیکھے ہیں جن کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کے لگائے ہوئے ہیں اور باغ کا مالک ان کی ایک کھجور کو دو ریال میں فروخت کرتا تھا۔ یہ دونوں درخت اپنے قد و قامت میں باغ کے تمام درختوں سے ممتاز تھے، پھر بھی دیکھنے والا شک آمیز تعجب کرتا تھا کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے لگائے ہوئے درخت اب تک کیسے موجود ہیں، اس طرح کے پھل بھی دیتے ہیں۔ اس باغ کے درخت اب جلا دیئے گئے ہیں۔

ہم نے احاطے کے اندر کنیسہ کی ایک جانب مسجد بھی دیکھی، جو بند تھی۔ اس کی حالت کنیسہ جیسی نہیں لیکن باہر سے خستہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ معلوم ہوا کہ صرف جمعہ یا عیدین کے لیے یہ مسجد کھلتی ہے۔

شجرۂ موسیٰ کی زیارت سے واپس آئے تو ایک قسیس نے ہمیں ایک کمرہ الاٹ کیا جو دس بستروں پر مشتمل تھا اور اس کی چابی ہمارے حوالے کر دی، کیوں کہ ہمارے سوا اس کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایک اور قسیس سے عربی میں باتیں کرنے لگا تو دورانِ گفتگو میں نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی :

"ولتجدن أقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا إنا نصارى"

(اور تم مودت کے اعتبار سے ایمان والوں کے سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں)

قسیس نے آیت کا باقی ماندہ حصہ خود پورا کر دیا :

"ذلك بأن منهم قسيسين ورهبانا وأنهم لايستكبرون"

(یہ اس لیے کہ ان میں قسیس (علماء) اور رہبان (صوفیاء) ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے)

الاٹ شدہ کمرے میں سامان رکھ دینے کے بعد خیال ہوا کہ بیر موسیٰ کا پانی لے بھی لیتے تو اچھا تھا۔ چناں چہ میں دوبارہ دیر کی طرف گیا۔ کوئی موجود نہ تھا اور چوں کہ دیر ہی کی دوسری منزل میں قسیسوں اور رہبانوں کی رہائش گاہ ہے اس لیے دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ پانی نکالنے کے لیے پہیہ چلایا تو گھبراہٹ میں اس کے ہینڈل کا کنارہ سر میں لگا اور خون نکل آیا۔ پلاسٹک کی دو بوتلیں بھر کر شجرہ کی دوبارہ زیارت کی۔ چوں کہ کوئی شخص موجود نہ تھا اس لیے خیال آیا کہ تبرک کے لیے اس کی کوئی شاخ کیوں نہ توڑ لوں۔ شاخیں کافی اونچی تھیں، میں نے اچھل کر شاخ پکڑی جو ہری تھی۔ خاردار کانٹوں سے میرا انگوٹھا اور دو انگلیاں خون آلود ہو گئے، تاہم میں نے توڑنے کی کوشش جاری رکھی، لیکن شاخ اتنی مضبوط تھی کہ میری کوشش رائگاں گئی اور مایوس ہو کر مجھے وہ شاخ چھوڑنی پڑی۔ نہ معلوم کیوں مجھے اس کی خوشی ہوئی کہ میرا خون اس جھاڑی پر لگ گیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب بیوی کے ساتھ پہلا حج کیا تو غلافِ کعبہ کو نیچے کی رسی کے ساتھ سیتے ہوئے سوئی چبھنے سے میرا خون کعبہ کے خلاف میں بھی لگ چکا ہے۔

اس شاخ سے مایوس ہو کر میں دوسری شاخ کی طرف اُچھلا۔ اتفاق سے اس کا اگلا سرا خشک تھا۔ وہ ٹوٹ کر ہاتھ میں آگیا اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ شجرہ کی لکڑی کا یہ ایک انچ سے کچھ بڑا حصہ میرے پاس دوسرے تبرکات کے ساتھ محفوظ ہے۔

جبلِ موسیٰ یا کوہِ طور :



مصر، جبلِ موسیٰ (کوہِ طور)

شبہ جزیرہ سیناء کا پہاڑی سلسلہ شمال مغرب سے جنوب مشرق تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی سلسلے کے ایک پہاڑ کو "جبلِ سیناء" کہتے ہیں اور جبلِ سیناء کے جنوبی سلسلے میں جو سب سے بلند پہاڑ ہے اسے "جبلِ موسیٰ" کہا جاتا ہے۔ جبلِ موسیٰ، جیسا کہ اس پمفلٹ میں لکھا ہے جو ہمیں سانت کاترین سے ملا تھا، ۷۲۶۲ قدم بلند ہے۔ نیچے سے اوپر تک راستے کے نشانات ہیں اور بیشتر مقامات پر ناہموار سی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ چوں کہ زیادہ تر کھڑی چڑھائی ہے اس لیے اس پر چڑھنا مکہ مکرمہ کے جبلِ نور تو کیا جبلِ ثور پر چڑھنے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔

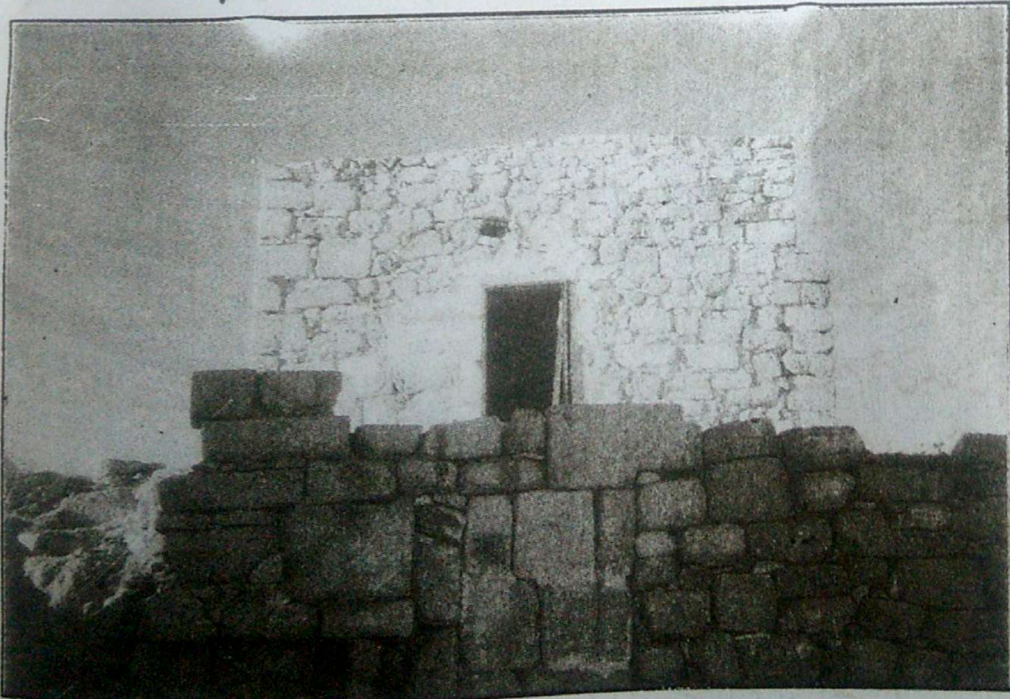
یہی وہ پہاڑ ہے جس کی "وادئ مقدس طویٰ" میں حضرت موسیٰ علے نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبوت ملی۔ یہی وہ پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر انھیں توراۃ عطا کی گئی اور یہی وہ پہاڑ ہے جو اللہ کی تجلی سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ پہاڑ کی حالت خود زبانِ حال سے اس کی شہادت دیتی ہے۔ زیادہ تر بھورے اور کالے رنگ کا یہ پہاڑ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اس طرح چیتھڑے بکھیر دیے گئے ہیں کہ بے شمار مقامات پر لبوریاں لٹکی ہوئی ہیں۔

قرآن کریم میں متعدد مواقع پر نبوت اور توراۃ ملنے اور اللہ کی تجلی سے پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا ذکر موجود ہے۔ جو لوگ جبلِ موسیٰ پر چڑھتے ہیں وہ عموماً رات کے دو بجے سے چڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور پانچ بجے تک چوٹی پر پہنچ پاتے ہیں۔ کمزور آدمیوں کو چار گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ پہاڑ پر جانے کے لیے رہبر ضرور ساتھ لینا چاہیے۔ میں نے بھی ایک رہبر سے وعدہ لے لیا تھا کہ دو بجے سے چڑھنا شروع کر دیں گے، لیکن کپتان نے، جو پہلے بھی اس پہاڑ پر چڑھ چکا تھا، کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے گا اس لیے میں نے گائیڈ نہ لیا اور یہ میری غلطی تھی۔ کپتان نے اس خیال سے کہ میں بوڑھا آدمی ہوں مجھے بارہ بجے ہی جگا دیا۔ اس طرح بمشکل ایک گھنٹے کی نیند میسر آئی۔ ہم ساڑھے بارہ بجے روانہ ہوئے، لیکن کپتان خود تو ہمارے ساتھ نہ چڑھا، دو سپاہیوں کو ساتھ کر دیا جن میں سے ایک سپاہی پہلے بھی پہاڑ پر چڑھ چکا تھا۔ میں نے بیوی اور بچی کو کمرے میں چھوڑا یہ کہہ کر کہ اندر سے تالا لگالو اور ٹارچ کی روشنی میں دونوں سپاہیوں کے ساتھ چڑھنا شروع کر دیا۔ راستہ میں دو غیر آباد چھوٹے چھوٹے کنیسہ بھی ملے اور نصف بلندی سے کچھ کم پر ایک چھوٹے سے میدان میں، جہاں سرو کے نہایت خوبصورت درخت کھڑے تھے، ایک بدو مع اہل و عیال کے آباد تھا۔ رات کے تین بجے ہم جس بلندی پر پہنچے وہاں سے اس راستے پر چل پڑے جہاں سے اُتار شروع ہو جاتا تھا۔ میں نے کہا: اب تو ہم اتر رہے ہیں۔ ایک سپاہی بولا: بس یہی پہاڑ ہے جسے دیکھنا تھا۔ میں نے کہا: اگر چوٹی پر نہ پہنچے تو اتنی مشقت اٹھانے کا فائدہ ہی کیا ہوا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ وہیں آرام کریں اور روشنی ہونے پر منزل کا تعین کریں۔ ایک سپاہی نے وہ بستر ساتھ لے لیا تھا جس کے اندر گھس کر سویا جاتا

ہے اور چوں کہ گرمی کا زمانہ تھا اس لیے میں اس کے فعل کو حماقت سمجھ رہا تھا، لیکن اس بلندی پر سپاہی کی عقل مندی کا علم ہوا۔ اتنی سخت سردی تھی جیسے چلہ کی سردی، سرد ہوا کے جھونکے کپکپی پیدا کر رہے تھے۔ ہم تینوں نے وہی بستر بچھایا، اس کو اوڑھا اور ایک دوسرے سے لپٹ کر اس طرح سو گئے کہ صرف اوپر کے بدن ڈھکے ہوئے تھے۔ اس سردی کے باوجود تکان کی وجہ سے نیند میں بے خبری رہی۔ پانچ بجے جاگے، میں نے تیمم کر کے نماز پڑھی۔ ایک سپاہی نے تو وہیں ہمت ہار دی اور واپس ہو لیا۔ دوسرا میرے ساتھ چڑھا لیکن تھوڑی دور ہی چڑھے کہ میں نے محسوس کیا کہ نیند کی وجہ سے اس کی ہمت بھی جواب دے رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا: تم یہیں سو جاؤ، میں تنہا چڑھتا ہوں اور واپسی پر تمہیں جگا لوں گا۔ چناں چہ تنہا روانہ ہوا۔ راستے میں کچھ لوگ اترتے ہوئے ملے، چڑھنے والا میرے سوا کوئی نہ تھا۔

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی مسافر ساتھ نہ تھا
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

چناں چہ پہاڑ کی چوٹی پر تنہا پہنچا جہاں ایک جانب چھوٹی سی مسجد تھی اور دوسری جانب ایک چھوٹا کنیسہ اور کنیسہ کے بازو میں چٹان تھی جس کے بارے میں نیچے آنے کے بعد کپتان



مصر، جبلِ موسیٰ (کوہِ طور) کی چوٹی پر مسجد

نے بتایا کہ وہی چٹان "صخرۂ موسیٰ" کہلاتی ہے، جس کے پاس حضرت موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ میں نے تیمم کر کے مسجد میں تحیۃ المسجد کے نفل پڑھے اور واپس چل پڑا۔ راستہ سے سپاہی کو جگایا اور نیچے اترنا شروع کر دیا۔

سب لوگ کہتے تھے کہ نیچے اترنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہیے جو وادی میں سے ہو کر آتا ہے، لیکن وہ راستہ ہمیں نہ مل سکا اور جس راہ سے چڑھے تھے اسی سے واپس آنا پڑا۔ اور جب اترنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ کھڑی چڑھائی کے مقابلے میں کھڑا اُتار بوڑھے آدمی کے بس کا نہیں۔ تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ گھٹنوں نے جواب دینا شروع کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں نے پچاسوں سیڑھیاں اس طرح طے کیں جسے وہ اپاہج جس کا نچلا دھڑ بیکار ہو، ہاتھوں کا سہارا لے کر کولھوں کے بل گھسٹتا ہے۔ اپنی جوانی یاد آئی کہ پہاڑوں پر سے گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوا اترتا تھا اور اب یہ حال کہ گویا ہر قدم پر پیر میں میخ ٹھونک دی گئی ہے۔ اگلا قدم اٹھتا ہی نہ تھا۔ خدا خدا کر کے صبح آٹھ بجے واپس منزل پر پہنچے اور نمک کے گرم پانی کا رانوں سے نیچے تک کاڑھال کیا تب کچھ چلنے کے قابل ہو سکا۔

پہلے روز جب ہم سانت کاترین کے قریب پہنچے تھے تو میں نے ایک جگہ ایک شخص کو جبلِ موسیٰ کے خوبصورت پتھر فروخت کرتے دیکھا تھا۔ ان میں سفیدی مائل چند پتھر ایسے بھی تھے جن کے ہر رخ پر شجرہ کی قدرتی صورت بنی ہوئی تھی۔ بڑے اچھے نمونے تھے۔ خیال آیا کہ خرید لوں، پھر یہ سوچ کر نہ خریدے کہ مجھے تو پہاڑ پر چڑھنا ہے، خود وہیں سے اٹھا کر لاؤں گا۔ لیکن پہاڑ پر مجھے وہ جگہ نظر نہ آئی جہاں اس طرح کے پتھر تھے۔ کوئی واقف کار ساتھ نہ تھا جو نشاندہی کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب سانت کاترین سے واپس آئے تو اسی دوکاندار سے چند پتھر خرید لیے۔ اچھے نمونے فروخت ہو چکے تھے، جو تھے انہیں پر قناعت کرنی پڑی۔ ان پتھروں کو جس طرف سے بھی توڑا جائے شجرہ کی صورت برآمد ہوتی ہے، ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔ لیکن ہم نے ایک پتھر کو توڑا تو درمیان میں کوئی صورت نہ تھی۔ دوسرے پتھر کو دو جگہ سے توڑا تو اس میں شجرہ کی ہلکی ہلکی صورتیں موجود تھیں۔ یہ پتھر میرے پاس محفوظ ہیں۔

پہاڑ سے اتر کر تھوڑی دیر آرام کیا اور ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم نے کپتان سے کہا کہ ہمیں بس اسٹاپ تک پہنچا دیں، کیوں کہ وہاں سے بس اسٹاپ تقریباً دو کلو میٹر دور تھا اور اپنی یہ کیفیت کہ ایک فرلانگ چلنا بھی مشکل تھا۔

قاہرہ جانے کے لئے یہاں سے چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بس ملتی ہے۔ بس کے آنے میں دیر تھی اس لیے کپتان نے کہا کہ اتنی دیر میں، میں دوسرے مقامات دکھائے دیتا ہوں۔ چناں چہ وہ ہمیں فوجی جیپ میں اس جگہ لے گیا جہاں سامری نے بچھڑا بنایا تھا۔ اس جگہ کی نشاندہی کے لیے کسی نے پہاڑ کی دیوار نما چٹان پر بچھڑے کی صورت کندہ کردی ہے۔ اسی کے مقابل تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک سفید کمرہ بنا ہوا ہے۔ کپتان نے بتایا کہ یہ "مقام ہارونؑ" کہلاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ جب توراۃ لانے کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو اسی جگہ حضرت ہارونؑ کی قیام گاہ تھی۔

پھر ہم قاہرہ کی سمت چند کلو میٹر اور چلے تو کپتان ہمیں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر لے گئے۔ وہاں ایک پختہ کمرے میں حضرت صالح علیہ السلام کی قبر تھی۔ دروازہ کے کتبے پر یہی لکھا تھا۔ ایک علحدہ کوٹھری میں مجاور بھی موجود تھا۔

کپتان نے ہمیں بتایا کہ ملک اردن شاہ حسین جب کار کے ذریعے قاہرہ آتے ہوئے اس راہ سے گذرے اور انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ حضرت صالحؑ کی قبر ہے تو انہوں نے کہا کہ حضرت صالحؑ کی قبر تو اردن میں ہے۔ یہاں کیسے آئی؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قبر کا تعین دشوار ہے۔ بعض کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسجد حرام میں زمزم اور ملتزم کے درمیان جو انبیاء مدفون ہیں ان میں حضرت صالحؑ بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

علامہ ابن تیمیہ نے اپنی فتاویٰ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ یہ بات تو یقینی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک مدینہ منورہ میں ہے اور حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی ازواج (علیھم السلام) کی قبور الخلیل میں ہیں، ان کے سوا کسی نبی کے

بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی قبور کہاں ہیں۔ بہر حال ہم اندر داخل ہوئے اور صلاۃ و سلام پڑھا۔

وہاں سے روانہ ہو کر قاہرہ ہی کی سمت مزید چلے تو کپتان نے ایک چٹان کے پاس گاڑی کھڑی کی۔ ہم نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں ایک سرخ چٹان کو تراش کر اسے کرسی کی شکل دے دی گئی ہے۔ کپتان نے بتایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کرسی کہلاتی ہے۔ اس پر بیٹھ کر وہ اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ اس کرسی کے سامنے کافی وسیع میدان بھی تھا۔

اس کے بعد ہم واپس ہوئے اور کپتان نے ہمیں بس اسٹاپ پر اتار دیا۔ بس کے انتظار میں ہوٹل پر بیٹھے ہوئے ہمیں بتایا گیا کہ جبلِ موسیٰ کے نیچے یہ وادی جو نظر آرہی ہے اس میں تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر اندر کی جانب وہ چٹان ہے جس میں سے عصا کی ضرب سے بارہ چشمے پھوٹے تھے۔ ڈیڑھ کلومیٹر پہاڑی راستہ طے کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اونٹوں پر جانے کی بات کی، لیکن یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ بس آنے کا وقت قریب ہے۔

لیکن سعودیہ واپس آکر جب اس پمفلٹ کو پڑھا جو سانت کاترین میں ملا تھا تو اس میں یہ دیکھا کہ وہ صخرہ جس سے حضرت موسیٰ کے عصا کی ضرب سے بارہ چشمے پھوٹے تھے، جبلِ موسیٰ کے مغرب میں "وادئ خیران" یا "وادئ شیخ" کے اس مقام پر ہے جسے "رُفَیدِیم" کہا جاتا ہے اور یہیں بنو اسرائیل نے عمالقہ سے جنگ کی تھی۔ واللہ اعلم۔

سانت کاترین:

سانت کاترین کے دیر (گرجا) سے مجھے عربی زبان میں چار ورق کا ایک پمفلٹ ملا، جو زقازیق کے بڑے اسقف "الانبا یا کو بوس" کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں سانت کاترین کے جو حالات درج ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سانت کاترین ایک عالمہ، راہبہ اور مبلغہ ہیں، جو شہنشاہ "مکسیمانوس" کے عہد میں

اسکندریہ میں پیدا ہوئیں۔ شہنشاہ بت پرست اور عیسائیت کا دشمن تھا۔ کاترین نے جب اسے بت پرستی سے تائب ہو کر عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی تو اس نے کاترین سے مناظرے کے لیے فلاسفہ کو جمع کیا۔ مناظرے کے نتیجے میں تمام فلاسفہ نے عیسائیت قبول کر لی۔ شہنشاہ نے سب کو زندہ جلوادیا اور کاترین کو قید کر دیا۔ دوسرے دن اپنے ساتھ شادی کی پیشکش کی اور کاترین کے انکار پر پہلے تو انہیں کوڑے لگوائے پھر دوبارہ قید میں ڈال دیا اور خود کسی مہم پر روانہ ہو گیا۔ اس کی ملکہ "فوستانا" کاترین کا فاضلانہ کلام سن چکی تھی، ان کا صبر وضبط بھی دیکھ چکی تھی اور اس نے کاترین کے بارے میں ایک اچھا خواب بھی دیکھا تھا۔ چناں چہ ایک رات قید خانے میں داخل ہوئی اور اس نے اور اس کے ساتھ ساتھ قید خانے کے محافظ "پروفیوس" نے مسیحیت قبول کر لی۔ شہنشاہ بارہ روز بعد جب واپس آیا تو کاترین کو طلب کیا اور انہیں صحیح وسالم پاکر غصے میں یہ حکم دیا کہ انہیں دانتوں والی چکی میں پیس دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی لیکن وہ پھر بھی محفوظ رہی۔ پھر جلادوں کو ان کے قتل کا حکم دیا لیکن جلادوں کے خود ہی ٹکڑے اڑ گئے۔ ملکہ "فوستانا" صبر نہ کر سکی اور اس نے شہنشاہ کو ملامت کرتے ہوئے اپنی اور پروفیوس کی مسیحیت کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ نے دونوں کو قتل کرا دیا۔

اس کے بعد کاترین نے کہا: اب میں رضاکارانہ طور پر خود کو قتل کے لیے پیش کرتی ہوں۔ چناں چہ رکوع کی حالت میں کھڑی ہو گئیں اور جلاد نے ان کی گردن اڑا دی۔ اس طرح ۲۵ر نومبر ۳۰۷ء کو انہوں نے شہادت پائی۔ راہبوں نے ان کی نعش کو ایک غار میں رکھ دیا اور "کنیسہ تجلی" کے سربراہ اور دوسرے راہبوں کو جو بشارتیں ہوئیں ان کے نتیجہ میں پانچ سو سال بعد کاترین کی نعش کو اس مقام سے لا کر جہاں انہیں دفن کیا گیا تھا، اس کنیسہ میں دفن کیا گیا جو "دیر سانت کاترین" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کنیسہ یونان کے "آرتھوڈوکس" چرچ کے تابع ہے۔

اس پمفلٹ میں "محتویات دیر سانت کاترین" کے عنوان سے ان چیزوں کی تفصیل بھی دی ہوئی ہے جو اس کنیسہ کے اندر موجود ہیں:

۱۔ شجرة العليقة المقدسة الذی كلم منها موسی ربه (وہ مقدس معلق جھاڑی جس سے موسیٰ سے ان کے پروردگار نے کلام کیا) (عربی عبارت اسی طرح ہے، اگرچہ قواعد کے لحاظ سے یہ غلط ہے)۔

۲۔ بیر موسیٰ (موسیٰ کا کنواں)۔

۳۔ الكنيسة الرئيسية (كنيسة التجلی) (مرکزی کنیسہ، کنیسہ تجلی)۔

۴۔ كنيسة العليقة المقدسة (كنيسة هيلن)۔ لکھا ہے کہ یہ دیر کا مقدس ترین مقام ہے اور اس میں جوتے پہن کر جانا منع ہے۔

۵۔ حجرة الجماجم۔ اس میں مختلف عہد کے لوگوں کی ہڈیاں ہیں اور دیر میں چھ قبریں بھی ہیں۔

۶۔ مكتبة الايقونات۔ ایقونات یعنی پینٹنگز کا کتب خانہ۔ ان کے ذریعے قدیم و جدید مسیحی دور کے واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں رومی حکمران "باولوسی" کے حکم سے اس طرح کی وہ تمام تصاویر جلادی گئیں جو دنیا کے بڑے بڑے کنائس میں موجود تھیں، لیکن سانت کاترین کی یہ تصاویر محفوظ رہیں اور آج دنیا میں جہاں بھی اس طرح کی تصاویر موجود ہیں وہ یا تو ان کی نقول ہیں یا یہیں سے چرائی گئی ہیں۔ ان تصاویر کی اور مختلف بادشاہوں کے ارسال کردہ ان تحفوں کی قیمت جو یہاں موجود ہیں، تقریباً ۲۵ ملین جرمن مارک بنتی ہے۔

۷۔ مکتبہ (لائبریری)۔ اس مکتبہ میں سُریانی، یونانی اور عربی زبانوں کے ہزاروں مخطوطات ہیں اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ مکتبہ دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اول نمبر "مکتبہ فاتیکان" کا ہے۔ یہیں سے لے جائے گئے بعض مخطوطات برطانیہ اور استنبول کے عجائب گھروں میں موجود ہیں۔

کاش میں دیر کے یہ نوادر بھی دیکھ سکتا لیکن ان کی خاطر بیوی اور بچی کی وجہ سے مزید چوبیس گھنٹے رکنا میرے لیے آسان نہ تھا۔

کبھی کبھی اپنے نصیب کا خیال کرتا ہوں تو زبان رشک سے اور آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں کہ آٹھ سال سے (ان سطور کے لکھتے وقت) مکہ مکرمہ میں ملازمت کی وجہ سے دولت بھی قدموں میں ہے، مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران تقریباً ہر روز بیت اللہ کا دیدار بھی میسر ہے اور ہر ایک دو ماہ بعد مدینہ منورہ کی زیارت بھی۔ مکہ اور مدینہ کے وہ مقامات جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے ان میں سے شاید ہی کوئی مقام بچا ہو جس کی میں نے زیارت نہ کی ہو۔ جبلِ نور اور جبلِ ثور پر چڑھ کر غارِ حراء اور غارِ ثور کی زیارت بھی کی اور اب بڑھاپے میں اللہ نے شجرۂ موسیٰ، جبلِ موسیٰ اور طویٰ کی وادیٔ مقدس کی زیارت بھی کرا دی اور زندگی رہی تو ابھی اور نہ معلوم کیا کیا دیکھنا مقدر ہے۔

یکم جولائی

قاہرہ کا پورا منظر دیکھنا ہو تو دریائے نیل کے کنارے بنے ہوئے فلک بوس "برج القاہرہ" پر چڑھنا چاہیے۔ ہم بھی یکم جولائی کو رات کے وقت اس برج پر چڑھے۔ دن کے وقت قاہرہ جتنا بدرونق نظر آتا ہے، جگمگاتی روشنیوں میں اتنا ہی خوبصورت نظر آیا۔ لفٹ کے لیے نصف گھنٹہ جاتے وقت اور ۱۵ منٹ واپسی کے لیے انتظار کرنا پڑا۔

قاہرہ کا "المتحف المصری" بھی دوبارہ دیکھا۔ قدیم معبودوں کے مجسمے، فراعنہ کے تابوت جن میں سے بعض پر سنہری کام اور اندرونی تابوت پر اس میں رکھی ہوئی نعش کی خوبصورت تصویر، تابوتوں کے چھوٹے بڑے مختلف سائز جن میں سے ایک کو دوسرے میں، دوسرے کو تیسرے میں، تیسرے کو چوتھے میں رکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد مقبرے میں دفن کیا جاتا تھا۔ حنوط شدہ لاشیں جن میں سے بعض کے پیر کے ناخن نظر آرہے تھے، بڑی بڑی شیشے کی بوتلوں میں حنوط کی ہوئی آنتیں، فراعنہ کے استعمال کے برتن اور اسبابِ زینت، غرض یہ کہ اس متحف یا میوزیم میں مصر کی قدیم تاریخ کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ ہم نے اپنے گائیڈ سے "فرعون موسیٰ" کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ اس میں خرابی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی، اس لیے اصلاح کے لیے اسے فرانس بھیجا گیا ہے۔

اسکندریہ :

۲؍جولائی

ٹرین کے ذریعے قاہرہ سے اسکندریہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ۵ پونڈ اور کچھ قرش کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ قاہرہ سے اسکندریہ جانے کے لیے دو راستے ہیں؛ ایک زرعی علاقے سے دوسرا ریگستانی علاقے سے۔ ہم زرعی علاقے سے گئے۔ دریائے نیل کی نہروں کا جال، جابجا بیل اور بھینسے کے ذریعے چلتے ہوئے رہٹ اور ہل، لہلہاتے ہوئے کھیت، کھیتوں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہوئی عورتیں، دیہاتوں میں چھتوں اور دیواروں پر تھپے ہوئے اپلے...... ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم پنجاب کے علاقے سے گذر رہے ہیں۔ ایک جگہ دیکھا کہ مرد گدھے پر سوار اور عورت پیدل۔ اس پر مجھے وہ مشہور لطیفہ یاد آگیا کہ ایک مرد گھوڑے پر سوار تھا اور عورت پیدل، کسی نے کہا: کیسا ظالم ہے کہ مرد ہو کر خود تو سوار ہے اور عورت کو پیدل چلا رہا ہے۔ اس نے بیوی کو سوار کرادیا اور خود پیدل چلنے لگا۔ کسی نے دیکھا اور کہا: کیسا زن مرید ہے۔ یہ سن کر دونوں سوار ہو گئے۔ کہنے والے نے کہا: کیسا ظالم ہے ایک جانور اور دو دو سوار۔ اس کے بعد دونوں اتر گئے۔ کسی نے کہا: کیسا بیوقوف ہے کہ خود تو پیدل چل رہے ہیں اور جانور خالی جارہا ہے۔ غرض انسان کسی حال میں بھی تنقید سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

راستے میں ”طنطا“ بھی پڑا، جہاں مصر کے معروف بزرگ شیخ احمد بدوی کا مزار ہے۔

۲؍جولائی

حضرت بوصیری کے مزار پر گئے۔ وہی بوصیری جن کے قصیدہ بردہ نے انہیں شہرتِ دوام بخش دی ہے۔ حضرت بوصیری کوڑھ کے مریض تھے۔ انہوں نے جب یہ قصیدہ لکھا تو رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے ان کے جسم پر اپنی چادر مبارک ڈالی۔ صبح آنکھ کھلی تو کوڑھ کا نام و نشان نہ تھا۔



مصر، اسکندریہ، امام بوصیری، قصیدہ بردہ کے مصنف

مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں باب السلام سے داخل ہو کر مزار اقدس کی طرف چلیں تو گنبدوں کی گولائیوں میں پورا قصیدہ بردہ لکھا ہوا ہے، جو عہدِ خلافتِ عثمانی میں لکھا گیا۔ اب اس کے وہ اشعار مٹا دیے گئے ہیں جو حنبلی عقائد کے خلاف ہیں۔



مصر، اسکندریہ، ابوالعباس المرسی کا مقبرہ

حضرت بوصیری کے مزار کے قریب ہی مشہور بزرگ حضرت ابوالعباس المرسیؒ کا شاندار مزار ہے۔

ان مزارات سے فارغ ہو کر اس علاقے میں پہنچے جسے "نبی دانیال" کہا جاتا ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام ہی کے نام کی ایک مسجد میں ان کا مزار ہے۔ مزار تہ خانے میں ہے جس میں سیڑھی کے ذریعے اترا جاتا ہے۔ اسی تہ خانے میں حکیم لقمان کا مزار بھی ہے جن کے نام سے قرآن کریم میں ایک مستقل سورۃ ہے۔

یہاں سے فارغ ہو کر "المنتزہ" اور "المعمورہ" گئے۔ یہ دونوں ساحلی علاقے اسکندریہ کی مشہور تفریح گاہیں ہیں۔

۳/جولائی

قلعہ قایتبائے گئے۔ ایک پونڈ ٹکٹ تھا۔ سفیدی مائل پتھر کا بنا ہوا یہ قلعہ اسکندرِ اعظم کے تعمیر کردہ "منارۂ اسکندریہ" کے ملبہ سے اسی کے کھنڈرات پر بنایا گیا ہے۔ "منارۂ اسکندریہ" دنیا کے سات عجائبات میں سے شمار ہوتا تھا۔

اسکندریہ میں تین سو سال قبل مسیح کی یونانی اور رومانی عہد کی قبریں بھی دیکھیں۔ انہیں "مقابر الانفوشی" کہا جاتا ہے۔ یہ قبریں پہاڑوں میں کھدی ہوئی ہیں۔

اسکندریہ میں ایک جگہ "قبر الجندی المجھول" (نامعلوم سپاہی کی قبر) ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ پہلے یہاں خدیو توفیق کا مجسمہ تھا، جسے ختم کر کے یہ قبر بنادی گئی ہے۔ بیرون ملک کے رؤساء و امراء یہاں آتے ہیں تو اس پر پھول چڑھاتے ہیں اور فوجی فتح مندیوں کے بعد بھی اس قبر پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔

اسکندریہ میں "مقابر کوم الشقافہ" بھی دیکھا۔ رومانی اور فرعونی دور کی تین سو قبریں تیس میٹر گہرے کنویں کی دیواروں میں بنی ہوئی ہیں۔ مردے کو اوپر سے اتارا جاتا تھا۔

جرانیت (Granite) کے ایک پتھر سے تراشا ہوا ۲۷ میٹر بلند اور ۵۵ ٹن وزنی "عامود السواری" دیکھا۔ اس عامود (ستون) کی کوئی بنیاد نہیں، صرف ایک چبوترے پر کھڑا

ہے، جس کے نیچے قدیم کتب خانہ اور معبود ”آپیس“ کا معبد ہے۔ ہم نے نیچے اتر کر بھی دیکھا۔ یہ عامود رومانی عہد میں ”دقلیاونوس“ کے زمانے میں تراشا گیا اور اسے ”اسوان“ سے لا کر یہاں نصب کیا گیا۔

متحف رومانی میں ایک مَسرح (تھیٹر) دیکھا۔ وسیع دائرے میں بنا ہوا یہ خوبصورت مَسرح اسی طرز کا ہے جیسے آج کل کے اسٹیڈیم۔

اسکندریہ میں ایک محلّہ ”سیدی جابر“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں حضرت جابرؒ کا مزار ہے، صحابی نہیں بلکہ ایک معروف بزرگ، جن کا انتقال ۷۶۹ھ میں ہوا۔ ہم نے اس مزار کی زیارت بھی کی۔ ایک جگہ ”سیدی بشر“ کا معروف مزار ہے۔ ہم نے اس کی زیارت بھی کی۔

اسکندریہ میں المتحف الرومانی الکبیر (بڑا رومانی میوزیم) بھی دیکھا۔ اس میں سونے، چاندی اور مختلف دھاتوں کے قدیم زمانے کے ہزاروں سکے اور ہزاروں مجسمے ہیں، جن میں ان کے معبودوں آپیس (بیل کی شکل)، سیرابیس (انسانی شکل، مگرمچھ، نسر کبیر، محبت کا دیوتا اور معبودہ افرودوتیس اور ایروس کے مجسمے بھی شامل ہیں۔ ایک مجسمہ غالباً رعمسیس ثانی کی بہن ”حوت مارع“ کا ہے۔ اسی نے حضرت موسیٰؑ کو پانی سے نکالا تھا، جیسا کہ اس کے مجسمے کے نیچے لکھا ہے۔ یہ میوزیم اپنے نادر ذخائر کے ساتھ قابل دید چیز ہے۔ اس میں مختلف جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں اور ہر شخص کی تصویر نیچے کلوز سرکٹ ٹی۔ وی پر آتی رہتی ہے۔

۴ر جولائی

عزیزم احمد حسین اجمیری کی تلاش میں قاہرہ کے پاکستانی سفارت خانے پہنچ گیا۔ سفارت خانے کی بیرونی دیوار پر تصویروں کی صورت میں مصریوں کی جاذبیت کے لیے انہی کے عام مذاق کے مطابق پاکستانی کلچر اس طرح پیش کیا گیا تھا گویا پاکستان بھی ایک بے حیا ملک ہے۔ میں نے چوکیدار سے ان تصویروں کا فوٹو لینے کی اجازت چاہی۔ اس نے اندر سے ایک صاحب کو بلایا اور انہوں نے ہمیں جواب دیا کہ سفارت خانے کی عمارت کا فوٹو لینا قانون کے

خلاف ہے۔ میں نے کہا: تاکہ پاکستان کے کسی اخبار یا رسالے میں ان تصویروں کی اشاعت نہ ہو سکے۔ وہ صاحب بھی پاکستانی تھے، میری بات سن کر خاموش ہو گئے۔ سفارت خانے میں دس گیارہ پاکستانی اور چار پانچ مقامی ملازمین ہیں۔ اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر ڈاکٹر محی الدین سے ملاقات ہوئی۔ راجہ ظفر الحق صاحب جو سفیر ہیں دفتر میں موجود نہ تھے۔

۵/ جولائی

جمعہ کی نماز جامع ازہر میں پڑھی۔ اس مشہور اور تاریخی مسجد کے امام کے چہرے کو ڈاڑھی سے بے نیاز دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ یہ لوگ ڈاڑھی کو تشریعی سنت نہیں مانتے، اسی لیے اس کا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ ازہر کے تفسیر و حدیث کے بعض شیوخ بھی بے ڈاڑھی کے نظر آتے ہیں۔

۸/ جولائی

قلعہ محمد علی دیکھا۔ مقطم کے پہاڑی سلسلے کے آخر میں واقع یہ عظیم الشان قلعہ "قلعہ محمد علی" اور "قلعہ صلاح الدین" کے ناموں سے مشہور ہے۔ اس کے اندر کی خوبصورت اور وسیع مسجد کے منارے دور سے نظر آتے ہیں۔ مسجد کے ایک جانب سفید سنگِ



مصر، قاہرہ، جبل مقطم پر مسجد اور قلعہ محمد علی

مرمر کی بنی ہوئی محمد علی کی پر شکوہ اور خوبصورت قبر ہے۔ اس کا میوزیم نیوی کے کنٹرول میں ہے۔ میوزیم میں مختلف ادوار میں استعمال کیا جانے والا سامانِ جنگ بھی ہے اور امراء و حکام کی تصویریں بھی۔ اس میں مصر کے مختلف ادوار کی پوری تاریخ محفوظ کر دی گئی ہے۔ یہ میوزیم دیکھنے کی چیز ہے۔ اسی قلعے میں ایک کنواں ہے جسے "بیر یوسف" کہا جاتا ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ وہی کنواں ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈالا گیا تھا، حالاں کہ یہ کنواں صلاح الدین ایوبی کی طرف منسوب ہے، جس کا نام یوسف تھا۔

قلعہ محمد علی سے واپسی پر پُر شکوہ اور فلک بوس مسجد رفاعی دیکھی اور اس کے صحن میں شیخ احمد کبیر رفاعیؒ کا شاندار مزار بھی۔ اسی کے ایک گوشے میں شاہ ایران اور شاہ فاروق کی قبریں بھی ہیں۔ دونوں کی قبریں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ شاہ فاروق کی قبر کا چبوترہ بلند ہے اور شاہ ایران کی قبر زمین سے ایک بالشت اونچی بھی نہیں اور اس پر ایران کا جھنڈا بنا ہوا ہے، جس کے دو شیر شہنشاہ کے سینے پر اب بھی سوار ہیں۔ کوئی مجھ جیسا ہی بھولا بھٹکا ان قبروں کے پاس پہنچ جاتا ہے، وہ بھی شاید فاتحہ پڑھے بغیر ہی واپس آجاتا ہے۔ اس کے برخلاف شیخ رفاعیؒ کے مزار پر ہجوم رہتا ہے۔ فقیری اور شہنشاہی کا یہ فرق بھی باعثِ عبرت ہے کہ



مصر، قاہرہ۔ مسجد شیخ احمد کبیر رفاعیؒ (دائیں جانب)، مسجد سلطان حسن (بائیں جانب)

مرنے کے بعد فقیر بادشاہ ہے اور بادشاہ فقیر۔

قطامش صاحب کے ساتھ ایک روز حلوان بھی گئے۔ یہاں گرم پانی کے چشمے ہیں۔ مصر میں پہلے طاعون کی وبا عام تھی اور طاعون کے زمانے میں لوگ حلوان کے پانی کا اہتمام کیا کرتے تھے کہ گندھک کی آمیزش کی وجہ سے یہ مفید ہے۔

قاہرہ کے جبلِ مقطم کے قریب سے کئی بار گذرے اور گذرتے ہوئے اس کے غاروں کے وہ زوایے بھی دیکھے جن میں کسی زمانے میں تارک الدنیا درویش رہا کرتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے اولیاالله بھی گذرے ہیں۔ اس کے اوپر کی سطح مستوی پر بھی آبادی ہے۔

مصر کے عوام بڑے خوشِ اخلاق اور شیریں سخن ہیں۔ ان کے اخلاق اور گفتگو کی یہ کیفیت ہم نے مکہ میں بھی دیکھی تھی اور مکہ میں رہتے ہوئے ہم یہ سوچتے تھے کہ مصر کے لوگ چاپلوس اور خوشامدی ہوتے ہیں، لیکن قاہرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ پوری عرب دنیا میں مصر ویسا ہی ہے جیسے ہندوستان میں لکھنو۔ کسی مصری سے آپ کسی جگہ کا پتہ دریافت کریں تو پورے سکون سے تفصیل سمجھائے گا اور جگہ قریب ہو تو منزل تک پہنچادے گا۔ ایک مصری سے ہم نے سیدہ سکینہ کا پتہ دریافت کیا تو حالاں کہ اسے کسی اور جگہ جانا تھا، ہمارے ساتھ ٹرین سے اترا، ٹرام میں بیٹھا، سیدہ سکینہ کے مزار تک پہنچایا، پھر اسی ٹرام سے واپس ہوا۔ البتہ مصر کے ڈرائیور بڑے حریص ہوتے ہیں اور مسافر کی جیبیں خالی کرانا خوب جانتے ہیں۔

ایک روز جب کہ ڈاکٹر قطامش اور استاد شلتوت دونوں موجود تھے، میں نے کہا: میں آپ دونوں کے اخلاق سے بہت متاثر و متعجب تھا، لیکن اب یہ کیفیت جاتی رہی۔ دونوں نے گھبرا کر پوچھا: وہ کیوں؟ میں نے کہا: سارے مصری ہی آپ جیسے ہیں۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ہندوپاک میں تو اب تک بے حیائی پر حیا اور بے پردگی پر پردہ غالب ہے۔ پاکستان سے سعودی عربیہ پہنچا تو جدہ (جہاں غیر ملکیوں کی کثرت ہے)، مکہ اور مدینہ (جہاں دوسرے ممالک کی بے پردہ عورتیں بھی حج اور زیارت کے لیے آتی ہیں) ان تین شہروں کو چھوڑ کر ہر جگہ پردہ ہی پردہ ہے۔ عرب عورت اگر جنگل میں بکریاں چرا رہی ہے تو اس کا منہ بھی بے

نقاب نہ ہو گا۔ لیکن مصر پہنچ کر خیال ہوا کہ ہم کسی نئی دنیا میں آگئے۔ قاہرہ کی راہوں میں ہمیں برقع نام کی کوئی چیز نظر نہ آئی، زیادہ سے زیادہ کوٹ اور سر پر اسکارف، وہ بھی عمر رسیدہ عورتوں کی حد تک، ورنہ زیادہ تر اسکرٹ۔ عورتیں مردوں کے ساتھ دفاتر میں کام کرتی ہیں، بسوں میں مردوں کے ساتھ بیٹھتی ہیں اور مردوں کے ساتھ دھکا پیل کرتی ہوئی بسوں اور ٹرینوں میں سوار ہوتی ہیں۔ مرد و عورت کا ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنا تو گویا معمول کے مطابق تھا، گلے میں ہاتھ ڈال کر چلتے بھی دیکھا اور ایک جگہ اس سے آگے کی بے حیائی بھی۔

مصر ایک غریب ملک ہے۔ قاہرہ کی سڑکیں تنگ ہیں اور معروف سڑکوں کے سوا عام سڑکیں جابجا شکستہ ہیں۔ عمارتوں کا رنگ عام طور پر مٹیالا ہے تاکہ بار بار رنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ فقراء کی کثرت ہے جو "بخشیش" کہہ کر ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ مزارات کے قریب فقراء کا بڑا ہجوم رہتا ہے اور ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنی منتیں پوری ہونے پر جب مزارات پر دیگیں لاتے ہیں تو فقراء ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بھی کم ہیں۔ یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر کو تقریباً آٹھ سو مصری پونڈ تنخواہ ملتی ہے۔

قاہرہ میں جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا شاید تیسرا سب سے بڑا شہر ہے، جتنی آبادی زندوں کی ہے شاید اس سے زیادہ مردوں کی۔ بے شمار کھلی قبروں کے علاوہ قبرستانوں میں بڑے بڑے کمرے بھی بکثرت ہیں، جن میں سے ایک ایک کمرے میں ایک ہی خاندان یا اس سلسلے کے متعدد افراد دفن ہیں۔ غریبوں نے ان کمروں کو بھی اپنا مسکن بنالیا ہے۔ ایک کونے میں کھانا پک رہا ہے تو سامنے کسی پختہ قبر پر رکھا ہوا ٹی وی بھی چل رہا ہے۔

یہاں بھی اولیا اللہ کے بکثرت مزارات ہیں۔ تقریباً ہر مزار پختہ اور بلند ہے۔ مزار پر آیات سے مزین چادریں، مردوں کے سرہانے بندھا ہوا عمامہ اور عورتوں کی قبروں پر کامدار دوپٹے۔ ہر مشہور مزار پر مصری مردوں اور عورتوں کا ہجوم، جالیاں چومنے اور اولیاء کے لیے

منتیں ماننے کا عام رواج، غرض یہ کہ ضعیف الاعتقادی اور حد سے بڑھی ہوئی عقیدت کیشی کا جو زور یہاں دیکھا، شاید اتنا زور پاک و ہند میں بھی نہیں۔

مصر کے بعد ہم نے استنبول دیکھا تو مزارات کے معاملے میں وہاں کا حال بھی مصر سے مختلف نہیں۔

مصر میں ہم نے جتنے میوزیم بھی دیکھے کسی میں فوٹو کی ممانعت نہ تھی۔ کیمرہ اندر لے جانے کی فیس مصریوں کے لیے ایک مصری پونڈ تھی اور غیر ملکیوں کے لیے دس پونڈ۔ ہمیں کسی مزار کا فوٹو لیتے بھی کسی نے نہیں روکا۔

مصر میں لوگ ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے بہ کثرت "یاحاج" کہتے ہیں۔ جماعت کی نماز کے بعد دائیں بائیں کے نمازی سے "حرَماً" کہتے ہوئے مصافحہ کرتے ہیں، یعنی اللہ حرم میں نماز نصیب فرمائے۔



مصر، کوہِ طور (جبلِ موسیٰ) کے دامن میں وہ مقدس جھاڑی جس میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے
اللہ تعالیٰ کی آواز سنی تھی



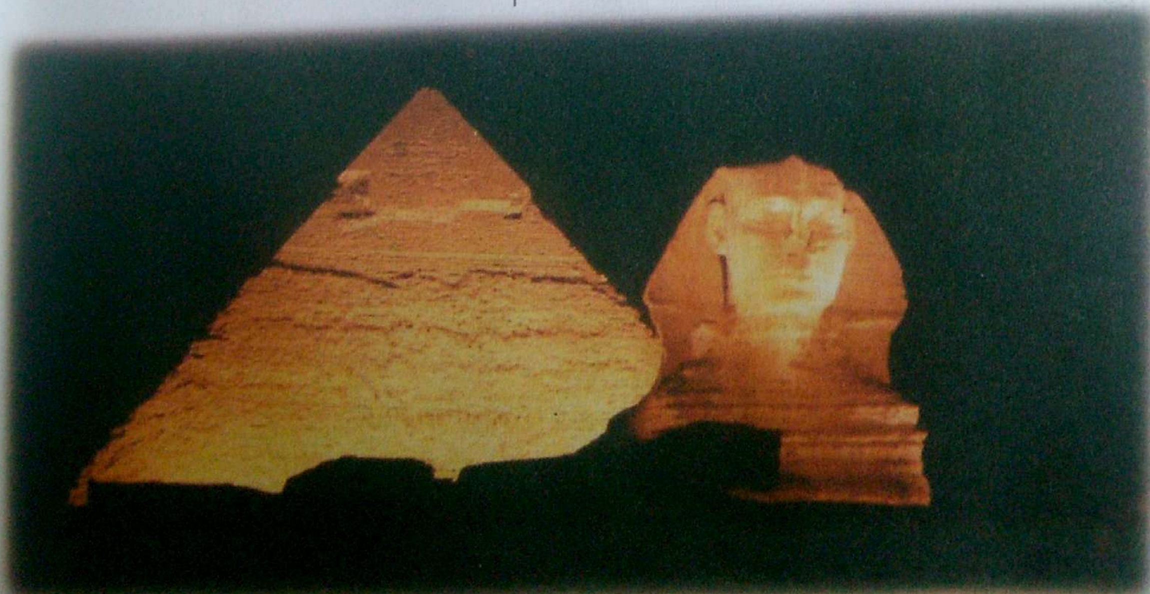
مصر، کوہِ طور کی چوٹی پر گرجا کا دروازہ اور اس کے بائیں جانب وہ چٹان جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام
بے ہوش ہو کر گرے تھے



مصر، کوہِ طور



مصر، اھرام



مصر، اھرام اور ابوالھول



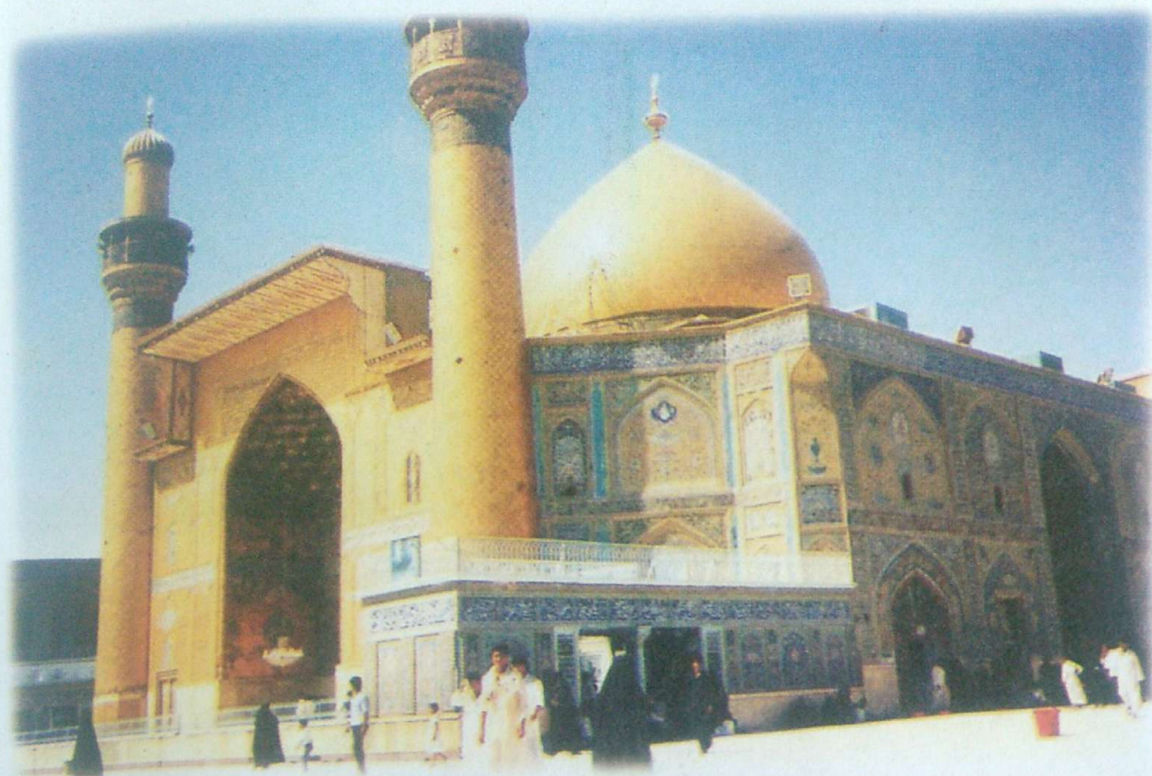
مصر، حضرت ذوالنون مصریؒ



مصر، حضرت امام شافعیؒ کا مقبرہ



مصر، اسکندریہ، جس پر بڑا سفید گلدان ہے وہ حضرت دانیالؑ کا اور دوسرا حضرت لقمانؑ کا مزار ہے



عراق، نجف، حضرت علیؓ کا مزار



عراق، کربلا، حضرت حسینؓ کا مزار

عراق

۲۰/ اگست ۱۹۸۸ء

رات کو دس بجے کے قریب عمان ایئر پورٹ سے روانہ ہوئے تھے اور ساڑھے گیارہ بجے سے ذرا پہلے بغداد ایئر پورٹ پر اتر گئے۔ کسٹم ہوا تو یہ بھی لکھوانا پڑا کہ اتنا زیور ہے اور اتنے ڈالر۔ دو بجے کے قریب ایئر پورٹ کے باہر آ کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ چوں کہ ۷/ محرم کی رات تھی، اس لیے لوگ بہ کثرت کربلا جا رہے تھے، اسی لیے ٹیکسی کا نرخ کافی اونچا تھا اور میٹر یہاں ہیں نہیں۔ بہ مشکل ایک ٹیکسی ملی، جس نے بعض دوسری سواریوں کے ساتھ دس دینار میں ساحۃ الوثبۃ پہنچایا۔

بغداد کے لیے روانگی سے قبل ایک مصری نے، جو انبار (عراق) میں مدرس تھے، کہا کہ عراق میں آپ کو سو ڈالر کے ۳۳ دینار ملیں گے، اگر آپ کو اعتبار ہو تو ڈالر مجھے دے دیجیے۔ میں ساحۃ الوثبۃ کے فندق الرشید پہنچ کر سو ڈالر کے سو دینار کے حساب سے دے دوں گا۔ میں نے انہیں تین سو ڈالر دے دیئے، لیکن نہ ساحۃ الوثبۃ میں فندق الرشید ہے اور نہ وہ پہنچے۔ میں نے انہیں معاف کر دیا تاکہ آخرت میں ان سے مواخذہ نہ ہو اور اس کے عوض اللہ تعالیٰ میری خطائیں بھی معاف فرمادے۔

شام کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ کافی شاندار مزار ہے۔ اس کے بعد دو دینار میں ٹیکسی لی اور الاعظمیہ پہنچے۔ جامع امام اعظم میں مغرب کی نماز پڑھی اور نماز سے پہلے ہی مزار پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی (شام، اردن اور عراق میں مزار کو "مقام"



بغداد، شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار کا گنبد (بوالاندر کی جانب)

کہتے ہیں)۔ جامع امام اعظم سے متعلق بڑا احاطہ ہے اور خاصی بڑی خوبصورت مسجد ہے اور مسجد کے قبلہ کے رخ کے بائیں جانب مزار مبارک ہے، جس کا دروازہ باہر سے ہے۔ مسجد کے اندر سے مزار کا جو دروازہ ہے وہ بند تھا اور اس پر پردہ پڑا تھا۔ مزار اقدس سادگی اور پرکاری کا خوبصورت مرقع ہے۔ صرف سفید اور بادامی رنگ کے حسین نقش و نگار ہیں۔ معلوم ہوا کہ ترک حاجی جو بسوں سے عراق ہوتے ہوئے حج کے لیے جاتے ہیں، مکہ مکرمہ جانے سے قبل یہاں ایک ہفتہ قیام کرتے ہیں۔

جامع الامام الاعظم میں مغرب کی نماز کی امامت جن صاحب نے کی ان کی سفید خشخشی ڈاڑھی تھی اور مغرب کی اذان کے بعد انہوں نے فوراً جماعت شروع کر دی، جیسا کہ احناف کی مساجد میں ہوتا ہے۔

بغداد میں اذان سے قبل یا اس کے بعد صلوٰۃ و سلام کا رواج نہیں اور سعودیہ کے سوا تمام عرب ممالک سے زیادہ یہاں پردے کا رواج ہے۔ عام طور پر عورتیں اوپر سے سیاہ چادریں پہنتی ہیں۔



بغداد، اعظمیہ، مسجد امام ابو حنیفہؒ

جامع الامام الاعظم میں مغرب کی نماز پڑھ کر کاظمیہ گئے، جہاں حضرت موسیٰ کاظم بن جعفر الصادق کا اور ان کے پوتے محمد الجواد کا مقام (مزار) ہے (محمد الجواد کے والد حضرت موسیٰ رضا کا مزار ایران میں ہے)۔

اسی احاطہ میں ایک جانب جامع امام ابو یوسف ہے، جس کے اندر قبلہ رو ہوں تو بائیں ہاتھ کو اندر کی جانب ایک کمرے میں مزار مبارک ہے۔

ہم کاظمین کے صحن میں جامع امام ابو یوسف سے عشاء کی اذان کی آواز کے منتظر رہے اور جب اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جماعت بھی ہو چکی۔ ایک صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہاں آواز سے اذان نہیں دی جاتی، اس لئے کہ باہر صحن میں تو سب شیعہ جمع ہیں، وہ یہاں نماز کے لیے کیوں آنے لگے۔

کاظمین، نجف اور کربلا وغیرہ (جن کی زیارت بعد میں کی) میں مزارات جتنے شاندار ہیں، بیت الخلا اتنے ہی غلیظ ہیں اور ان کے صحنوں میں بھی صفائی کا اہتمام نہیں۔

ہم ۲۰؍ اگست کو یہاں پہنچے اور ۲۰؍ اگست کی صبح سات بجے سے پورے عراق میں

سات روز کے لیے جشن فتح منایا جارہا تھا۔ جگہ جگہ ڈھولک کی تھاپ پر ناچتے گاتے جوان اور بچے، کہیں معمولی سے جھنڈوں سے سجے ہوئی گاڑیوں کے جلوس، لوگ جگہ جگہ جگوں اور پچکاریوں میں پانی لیے ہر گذرنے والی گاڑی کی سواریوں پر ڈالتے تھے۔ ہم جب کاظمیہ سے واپس ہوئے تو کئی جگہ ہمیں پانی سے بچنے کے لیے گاڑی کے شیشے چڑھانے پڑے۔ گویا خوشی کے مواقع پر یہاں رنگ کے بجائے پانی سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔

جامع امام اعظم میں ادھر مغرب کی اذان شروع ہوئی اور ادھر دور سے جشن فتح کے سلسلے میں توپیں داغے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں نماز کے بعد تک آتی رہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ ایک سوایک توپیں داغی گئیں، اس لیے کہ اذان ختم ہونے تک میں چالیس آوازیں گن چکا تھا۔

کاظمیہ سے عشاء کے بعد واپس آتے ہوئے دور سے روشنی کے گولے چھوٹتے ہوئے بھی دیکھے، بہت خوبصورت اور مختلف رنگوں کے۔ دوسال پہلے ہوسٹن (امریکہ) میں جو منظر دیکھا تھا، وہی منظر سامنے آگیا۔

۲۱/ اگست ۱۹۸۸ء = ۹/ محرم ۱۴۰۹ء

سوچا کہ آج ۹/ محرم ہے، آج امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا دن ہے۔ آج کے دن شیعہ حضرات دور دراز سے یہاں آتے ہیں اور اسے بڑی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ ہم جب بغداد میں موجود ہیں تو کیوں نہ آج ہی کربلا جائیں۔ چناں چہ صبح چھ بجے "گیراج (بس اسٹاپ) علاوی" پہنچ گئے۔ کربلا کے لیے بڑا ہجوم تھا، بس کوئی موجود نہ تھی۔ جو بس بھی آکر رکتی مرد اور عورتیں اس کی طرف دوڑتے۔ اتفاق سے ایک کوسٹر والے نے نجف کی آواز لگائی۔ ہم نے سوچا کہ نجف بھی جانا ہے، کیوں نہ نجف جاکر کربلا جائیں۔ چناں چہ دو دینار فی کس کے حساب سے اس میں سوار ہوگئے۔ نجف سے پہلے کوفہ آتا ہے۔ کسی زمانہ میں یقیناً اس کی شان و شوکت تھی، اب تو معمولی سی بستی نظر آتی ہے۔ البتہ اس کی مسجد بڑی وسیع اور شاندار تھی، پختہ رنگین نقش و نگار سے مزین۔ معلوم ہوا کہ یہ مسجد اسی مسجد کی جگہ ہے جس میں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شہید کیا گیا تھا۔ واللہ اعلم۔ ہم نے صرف گذرتے ہوئے وہ مسجد اور کوفہ دیکھے۔ سعودیہ واپس آکر جب یہ معلوم ہوا کہ اسی مسجد کے صحن میں وہ بڑا سا تنور بھی ہے جس سے طوفانِ نوح میں پانی جاری ہوا تھا تو اسے نہ دیکھنے کا بڑا افسوس ہوا۔

نو بجے نجف پہنچے۔ پہلے ناشتہ کیا، پھر وضو کر کے حضرت علیؓ کے مزار پر فاتحہ کے لیے اندر گئے۔ وسیع اور شاندار احاطہ ہے۔ دروازے اور گنبد پر سونے کا پانی پھرا ہوا ہے اور مزار



بغداد، نجف، حضرت علیؓ کے مزار کا اندرونی منظر

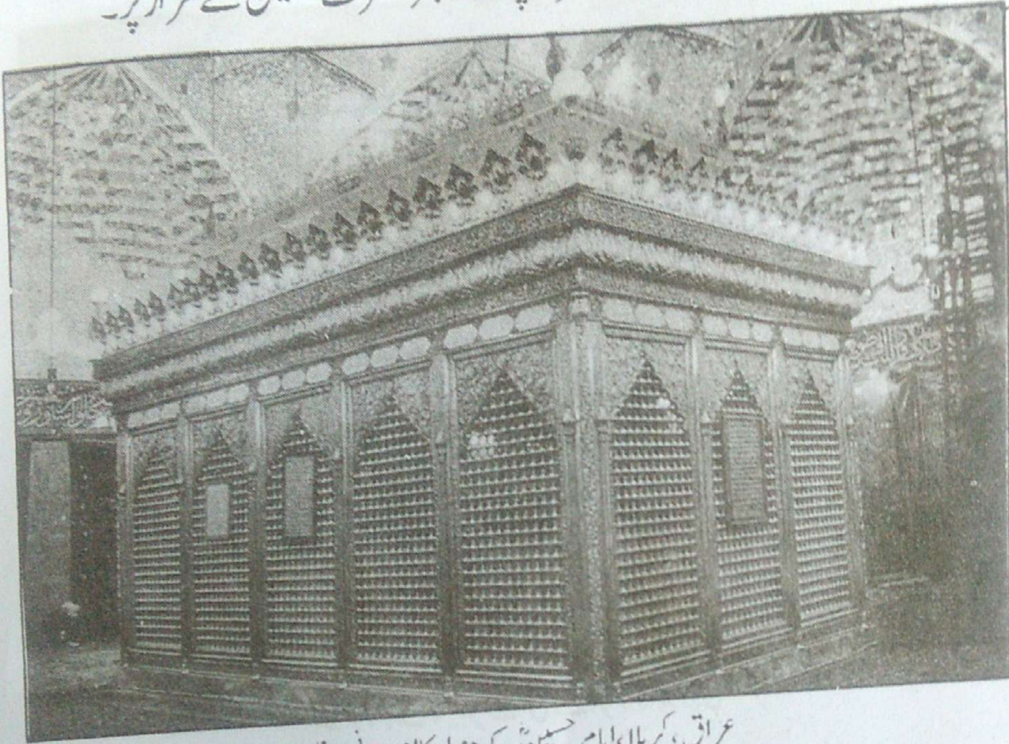
نہایت شاندار ہے۔ نجف میں حضرت علیؓ کے مزار مبارک کے اندر ڈھیروں دینار پڑے ہوئے تھے جو زائرین ڈالتے جاتے تھے۔ مزار کے احاطے کے اندر اور باہر لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ یہ بھی دیکھا اور بعد میں یہی بات کربلا میں دیکھی کہ دو دو آدمی لکڑی کے تابوت اٹھائے ہوئے آتے تھے (شاید یہ تعزیہ تھا) اور مزار کے تین طواف کر کے "لا الہ الا اللہ" پڑھتے ہوئے واپس چلے جاتے تھے۔

نجف میں اور کربلا میں تمام تر شان و شوکت کے باوجود بیت الخلاء اتنے گندے ہیں کہ جانے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ ایسے مقدس مقامات پر ایسی گندگی عجیب سی بات ہے۔ یہ اثر

ہے شاید پورے عراق کی عام حالت کا۔ شام کی طرح عراق میں بھی عام طور پر بیت الخلاء بے انتہا گندے ہوتے ہیں۔

کوفہ کے مقابلے میں نجف کی بستی زیادہ اچھی ہے۔

نجف سے بذریعہ بس روانہ ہو کر پونے گیارہ بجے کربلا پہنچے۔ وہاں نجف کے مقابلے میں زیادہ ہجوم تھا۔ پہلے حضرت عباسؓ کے مزار پر گئے، پھر حضرت حسینؓ کے مزار پر۔



عراق، کربلا، امام حسینؓ کے مزار کا اندرونی منظر

حضرت عباسؓ اور حضرت حسینؓ کے مزارات کے درمیان وسیع میدان ہے جس میں کوئی سواری نہیں جاتی۔ حضرت عباسؓ کے مزار کے اوپر "السلام علیك یا قمر بنی هاشم" اور حضرت حسینؓ کے مزار پر "یا ثار اللہ" (اے اللہ کے انتقام) لکھا ہوا ہے۔

ہم نے بغداد میں جتنے مزار دیکھے ان پر شاید سب سے خوبصورت حضرت حسینؓ کا مزار ہے۔ نچلے حصے پر چاندی کے اور بالائی حصے پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے۔

کربلا کے مزارات کی زیارت میں ہم نے خاصے ہجوم اور تعزیوں کے طواف کے سوا اور کوئی خاص بات نہیں دیکھی، لیکن کربلا سے دو بج کر دس منٹ پر روانہ ہو کر جب ہم بس

اسٹینڈ سے ٹیکسی میں ہوٹل جا رہے تھے تو ڈرائیور نے، جو سوری تھا، بتایا کہ بعث پارٹی کی حکومت سے پہلے کربلا میں ایک شخص کو "عمر" بنایا جاتا تھا اور اسے جوتے مارے جاتے تھے۔ موجودہ حکومت کی سختی کی وجہ سے اب یہ باتیں نہیں ہوتیں۔ گفتگو کے دوران جب میں نے اسے بتایا کہ میں سوریا ہو کر آرہا ہوں تو اس نے کہا کہ میں وہاں سے بھاگا ہوا ہوں، صرف اپنے دین کو بچانے کی خاطر۔ لیکن انشاء اللہ ایک روز ہم سوریا واپس جائیں گے۔ اس نے مزید کہا کہ اگرچہ سوریا اور عراق دونوں میں بعث پارٹی کی حکومت ہے لیکن کم از کم صدام حسین سنی تو ہے بخلاف حافظ الاسد کے کہ وہ علوی ہے۔

ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مسجد میں گئے اور مغرب کی نماز وہیں پڑھی۔ مزار اور مسجد کے سامنے جو بیرونی چبوترہ ہے اس میں مغرب کی نماز ہوئی۔ شیخ طٰہٰ نے جو مؤذن اور مقرئ ہیں، حنفی طرز پر، کہ رفع یدین نہیں کیا، امامت کی۔

مزار پر ایک صاحب "فقیر محمد" موجود رہتے ہیں۔ لوگوں کی رہنمائی بھی کرتے رہتے ہیں،



بغداد، مسجد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

لوگ انہیں پیسے بھی دیتے رہتے ہیں اور ان کی عزت بھی کرتے ہیں۔ یہ صاحب پشاور سے آگے آزاد قبائل کے رہنے والے ہیں اور ۳۵ سال سے بغداد میں مقیم ہیں۔ گویا مزار عملاً حنفیہ کے قبضے میں ہے، حالاں کہ حضرت شیخ حنبلی ہیں۔ حنابلہ میں سے بعض حضرات تو حضرت شیخ کو مشرک کہتے ہیں، پھر غیر حنابلہ کا قبضہ کیوں نہ ہو۔

فقیر محمد صاحب نے بتایا کہ مزار کے بالائی حصے پر چاندی کا جو پتر چڑھا ہوا ہے وہ ایک سال پہلے پاکستانیوں نے چندے سے چڑھایا ہے۔

مغرب کے بعد شیخ عمر شہاب الدین سہروردیؒ کے مزار پر گئے۔ اس خیال سے کہ عشاء کی نماز وہیں پڑھیں گے، مسجد میں پہنچے۔ اس کا اندرونی حصہ اور مزار کا دروازہ بند تھے۔ کہا گیا کہ عشاء کے وقت کھلیں گے۔ لیکن اس اطراف میں اتنا سناٹا تھا کہ عشاء تک انتظار کرنے کو جی نہ چاہا۔ چناں چہ واپس ہوئے اور بہت دور جا کر بڑی مشکل سے ٹیکسی ملی۔ اس کے بعد دوبارہ اس مزار پر حاضری کا موقع نہ ملا۔

۲۲/ اگست ۱۹۸۸ء

آج حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی اور حضرت معروف کرخی کے

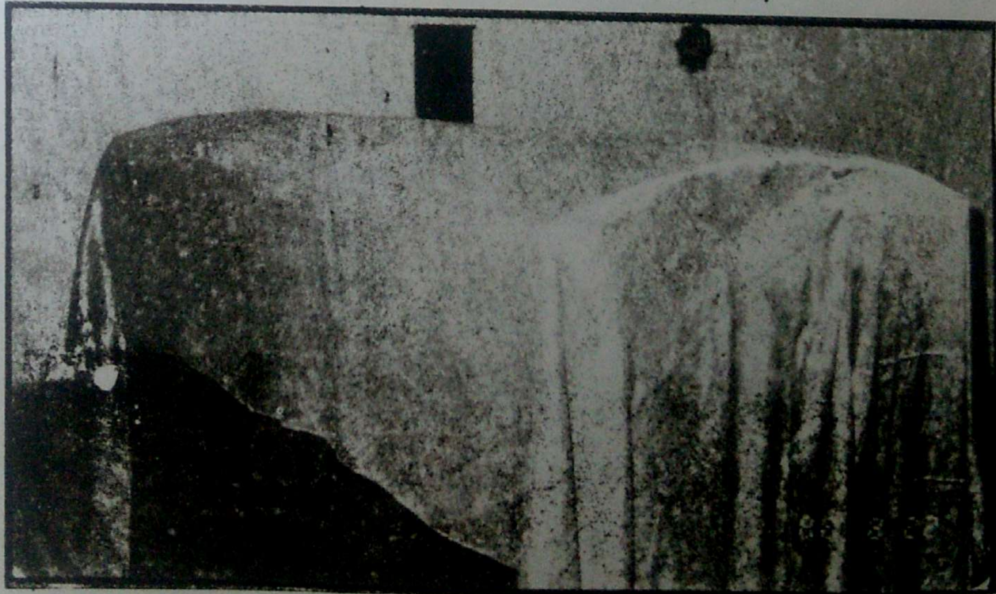


بغداد، حضرت معروف کرخیؒ



بغداد، کرخ، ملکہ زبیدہ

مزارات کا رخ کیا۔ پہلے حضرت سری سقطی اور حضرت جنید بغدادی کے مزارات پر پہنچے جو شہر سے کافی دور تھے۔ پھر حضرت معروف کرخیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ واپسی میں قریب ہی حضرت آلوسی صاحب روح المعانی کے مزار پر نظر پڑی۔ پھر قبرستان کے باہر کی جانب سے ہارون الرشید کی مشہور ملکہ زبیدہ کی قبر پر گئے۔ راستے میں گھوڑے بندھے تھے، جن کے پیشاب اور لید کی بو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ پھر اسی بدبودار علاقے سے گذرتے ہوئے حضرت منصور حلاجؒ کے مزار پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔



بغداد، کرخ، حضرت منصور حلاج

شام کو خیال ہوا کہ "سلمان پاک" ہو آئیں۔ چناں چہ باب شرقی کے بس اسٹاپ پہ پہنچے۔ سرکاری بسیں عام تعطیل کی وجہ سے بند تھیں، صرف پرائیوٹ کوسٹر چل رہی تھیں۔ کوسٹر میں سوار ہوئے اور ایک جگہ اترے جسے غالباً "جرجاسہ" کہتے ہیں وہاں سے سلمان پاک کے لیے دوسری کوسٹر میں بیٹھے اور مغرب سے پہلے سلمان پاک پہنچ گئے۔ مسجد میں عصر کی نماز ادا کر کے پہلے حضرت سلمان فارسیؓ کے مزار پر حاضری دی اسکے بعد دوسری طرف گئے۔ وہاں ایک کمرے میں حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا مزار ہے اور اس کے سامنے دوسرے کمرے میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ کا اور اسی کے ساتھ حضرت طاہر بن محمد بن علی بن الحسین کا۔



بغداد، سلمان پاک، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ

حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار خاصا خوبصورت ہے، شاید اس لیے کہ ان کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "سلمان منا أهل بيت" (سلمان ہمارے اہلِ بیت سے ہیں)۔

کوسٹر کے ڈرائیور نے ڈرا دیا تھا کہ اگر آپ کو سات سوا سات یہیں بج گئے تو پھر بغداد کے لیے کوئی سواری نہ ملے گی، چناچہ مغرب سے قبل ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

آج سے تقریباً تیس سال پہلے ایک خاتون محمودہ سلطانہ کا سفرنامہ پڑھا تھا، جو انگریزوں کے دور میں حکومتِ ہند کی طرف سے عراق کے کلچرل اٹیچی کی اہلیہ تھیں۔ موصوفہ نے اس میں چشم دید حالات لکھے ہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کے مزارات کو ان کے اصل مقام سے موجودہ مقام پر کس طرح منتقل کیا گیا۔ اس کا خلاصہ جو کچھ حافظے میں محفوظ ہے یہ کہ شیخ الاسلام سے حضرت سلمان فارسیؓ نے خواب میں فرمایا کہ دجلہ کا پانی ہماری قبور کے قریب پہنچنے والا ہے، ہماری نعشوں کو یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔ شیخ الاسلام نے شاہ عراق فیصل تک یہ خبر پہنچائی۔ فیصل نے چیف انجینئر سے کہا،



بغداد، سلمان پاک، حضرت جابر بن عبداللہؓ

چناں چہ قبور کے پاس دجلہ کی سمت میں کھدائی کی گئی، پانی کے کوئی اثرات نہ تھے۔

شیخ الاسلام نے دوبارہ وہی خواب دیکھا اور فیصل تک خبر پہنچائی۔ فیصل نے غصہ سے کہا کہ چیف انجینئر کی رپورٹ آپ کو معلوم ہے، پھر بھی آپ کو اصرار ہے تو آپ فتویٰ دیں، میں نعشوں کو منتقل کرائے دیتا ہوں۔ چناں چہ شیخ الاسلام نے فتویٰ دے دیا اور بادشاہ کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ ذی الحجہ کی فلاں تاریخ کو نعشیں منتقل کی جائیں گی۔ مکہ مکرمہ

سے حاجیوں کے تار پہنچے کہ ہم بھی اس تقریب میں شریک ہونا چاہتے ہیں، اس لیے محرم تک مؤخر کردیا جائے۔ چناں چہ اسے محرم تک مؤخر کردیا گیا (تاریخیں اور سنہ میرے حافظے میں نہیں)۔ رائٹر نے اس خبر کو دنیا میں پھیلا دیا اور مختلف ممالک کے وفود بغداد پہنچ گئے۔ قبور کے قریب ایک جرمن ٹیلیوژن کمپنی نے دو سو فٹ لمبا اور اسی مناسبت سے چوڑا اسکرین بلندی پر لگا دیا تھا، تاکہ وہاں موجود لاکھوں افراد پورا منظر دیکھ سکیں۔ حضرت سلمانؓ اور حضرت جابرؓ کی نعشوں کو بلیڈ کے ذریعہ جب قبروں سے نکالا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ کفن تک میلا نہ تھا۔ نعشوں کو تابوتوں میں رکھ کر لمبے لمبے بانس لگائے گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کاندھے دے سکیں۔ ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی اور انہیں موجودہ مقام پر دفن کردیا گیا۔

محمودہ سلطانہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ دفن کے دن اور اس کے بعد کئی روز تک بکثرت عیسائی اور یہودی اسلام لاتے رہے۔ آنکھوں کے ایک جرمن ڈاکٹر سے جب انہوں نے اسلام لانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ میں نے ان آنکھوں میں وہ چمک دیکھی جو صرف زندہ انسانوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

۲۳ر اگست ۱۹۸۸ء

"المتحف العراقی" (عراقی میوزیم) دیکھا۔ فتح کی خوشی میں میوزیم مفت دکھایا جارہا تھا۔ قاہرہ کا میوزیم اس سے کہیں بہتر ہے۔

اس کے بعد امامِ اعظم کے مزار پر دوبارہ حاضری دی، اس کے لیے اہلیہ کا بہت اصرار تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ اصرار کیوں؟ جواب دیا: ہمارے امام جو ہیں۔

وہاں سے واپس ہو کر ٹیکسی کے ذریعے حضرت شیخ جیلانیؒ کے مزار پر پہنچے۔ ٹیکسی ڈرائیور غالباً شیعہ تھا، اسی لیے اس نے صدام حسین کو کافر اور خمینی کو اس سے بہتر کہا۔ بہر حال باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں اسلام کا درد ہے۔ اس نے بتایا کہ بغداد شہر میں ڈھائی سو تھیٹر ہیں اور اتنی تعداد مسجدوں کی بھی نہیں۔ اسی طرح کی اور باتیں سارے راستے کرتا رہا جو یاد بھی نہیں رہیں۔

حضرت جیلانیؒ کے مزار پر پہنچ کر میں نے بیوی کو تو مسجد میں بٹھایا کہ آپ قرآن پاک پڑھتی رہیں اور میں امام غزالی کا مقبرہ دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ حضرت شیخ جیلانیؒ کے مزار کے قریب ہی ایک قبرستان ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ مقابر غزالی ہی کہلاتا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا اور مزار اتنا قریب بھی نہ تھا۔ بہر حال مزار پر پہنچا جو بند تھا، صرف کھڑکی کھلی تھی، باہر ہی سے فاتحہ پڑھی (بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ امام غزالی کا مزار طوس میں ہے، یہاں کوئی اور غزالی مدفون ہوں گے)۔ وہاں سے واپس آکر بیگم صاحبہ کو ساتھ لیا، ہوٹل آیا، سامان باندھا اور چھ گھنٹہ قبل ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ ٹیکسی والے نے دس دینار لیے۔

یہ ٹیکسی ڈرائیور ایک فوجی جوان تھا، جو چھٹی لے کر گھر آیا ہوا تھا۔ راستہ بھر بڑی پُرجوش باتیں کرتا رہا۔ کہنے لگا کہ میں مشرقی عراق کے پہاڑی علاقے کا باشندہ ہوں۔ صدام حسین کا تعلق میرے ہی قبیلے سے ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان ہم "عرب بن عرب بن عرب" سے کہیں زیادہ اچھے ہیں۔ فتح کا جشن منایا جارہا ہے تو بجائے اس کے کہ نمازیں پڑھیں، اللہ کا شکر ادا کریں، ناچ رنگ ہو رہے ہیں، حتی کہ ٹی وی پر اعلان کیا گیا کہ عراقی قوم فتح کی خوشی میں شرابیں پی کر رقص کر رہی ہے۔ کہنے لگا کہ جب تم شیعہ نہیں تو ۹ر محرم کو کربلا کیوں گئے؟ کہا کہ اگر ایک دن کے لیے مجھے اقتدار مل جائے تو میں پوری شیعہ قوم کو تہ تیغ کر دوں۔ غرض یہ کہ اس طرح کی باتیں پورے راستے کرتا رہا۔ عراق میں کسی ٹیکسی ڈرائیور کی کسی بات کا اعتبار نہیں، ان میں سے بہ کثرت جاسوس ہوتے ہیں اور سواریوں کے رجحانات معلوم کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

ٹکٹ پر ہماری فلائٹ کا وقت رات کے نو بجے کا لکھا ہوا ہے، لیکن اس وقت سوا گیارہ بج رہے ہیں اور سعودیہ کا طیارہ اب تک نہیں پہنچا۔ چناں چہ ایئرپورٹ پر طیارے کے انتظار میں بیٹھا، اپنے سفر کا یہ اختتامیہ لکھ رہا ہوں۔

• بغداد میں جنگ (عراق ایران) کے اثرات کی وجہ سے کافی گرانی ہے۔ تنور کی بھونی ہوئی آدھی مرغی دو دینار یعنی بیس سعودی ریال (۱۶۰ روپے پاکستانی) میں ملتی ہے اور ایک

دینار اس طرح صرف ہوتا ہے جیسے سعودیہ میں ایک ریال۔ شام اور اردن میں جس طرح گاڑیوں میں میٹر ہیں اور ان کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے، یہاں اس طرح میٹر نہیں اور مشکل ہی سے کوئی شخص ایک دینار سے کم میں کہیں جانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ ایک ڈرائیور نے بتایا کہ پہلے یہاں بھی میٹر تھے، لیکن جنگ کی وجہ سے جب عراقی دینار کی قیمت چوتھائی رہ گئی تو میٹر ختم کر دیئے گئے۔ بسوں کے کرائے البتہ سستے ہیں۔

بغداد میں اور بغداد سے باہر ہر جگہ صدام حسین کے بے انتہا فوٹو لگے ہوئے ہیں۔ مشکل ہی سے کوئی دوکان، ہوٹل، چوراہا اور سڑک ایسی ہو جہاں صدام کے فوٹو نہ ہوں۔ البتہ حافظ اسد کی طرح صدام کا اسٹیچو کہیں نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے ایسی جگہ ہو جہاں سے ہمارا گذر نہیں ہوا۔

عراق میں جتنی پولیس نظر آئی شاید کسی عرب ملک میں نہیں۔ غالباً یہ جنگ کا اثر ہے کہ اندرونِ ملک تخریب کاری نہ ہو سکے۔

بغداد میں دجلہ کا پانی صاف کر کے پیا جاتا ہے۔ یہ پانی اتنا شیریں ہے کہ ٹھنڈا ہو تو گلاس سے منہ ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ یاد نہیں کہ ہم نے اس سے زیادہ شیریں اور لذیذ پانی کہیں اور پیا ہو۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار جس علاقے میں ہے اسے مدائن کہتے ہیں۔ اس مزار سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر کسریٰ کے محل کی وہ دیوار اب تک موجود ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ کے موقع پر اس کا کنگرہ گر گیا تھا۔ بغداد کے لیے رات کی آخری بس روانہ ہونے کا وقت آ چکا تھا اور وہاں رات گذارنے کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے افسوس ہے کہ ہم وہ دیوار نہ دیکھ سکے۔



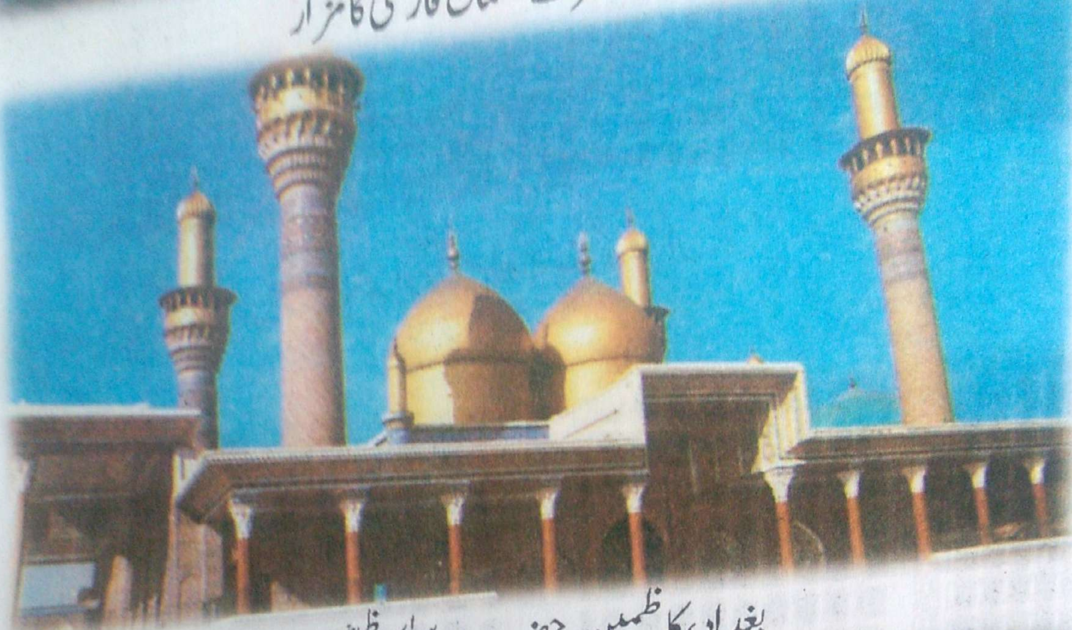
بغداد، امام ابو حنیفہؒ کا مزار



بغداد، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار کی جالیاں



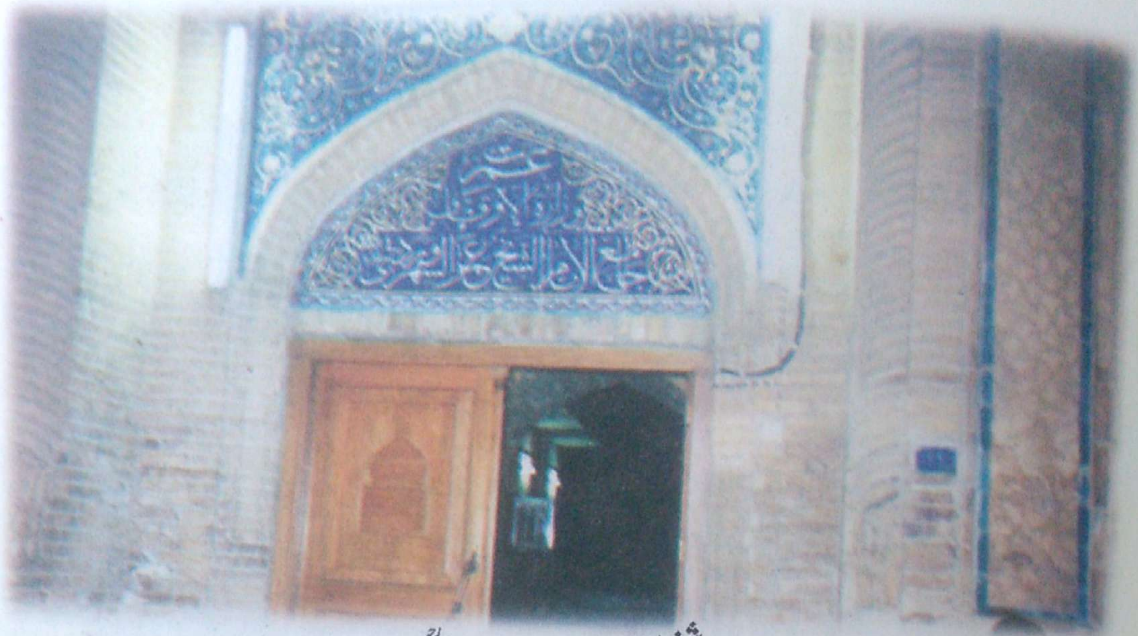
بغداد، حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار



بغداد، کاظمین، حضرت موسیٰ کاظمؒ کا مزار



بغداد، کاظمین، امام ابو یوسفؒ کی مسجد اور اندر مزار



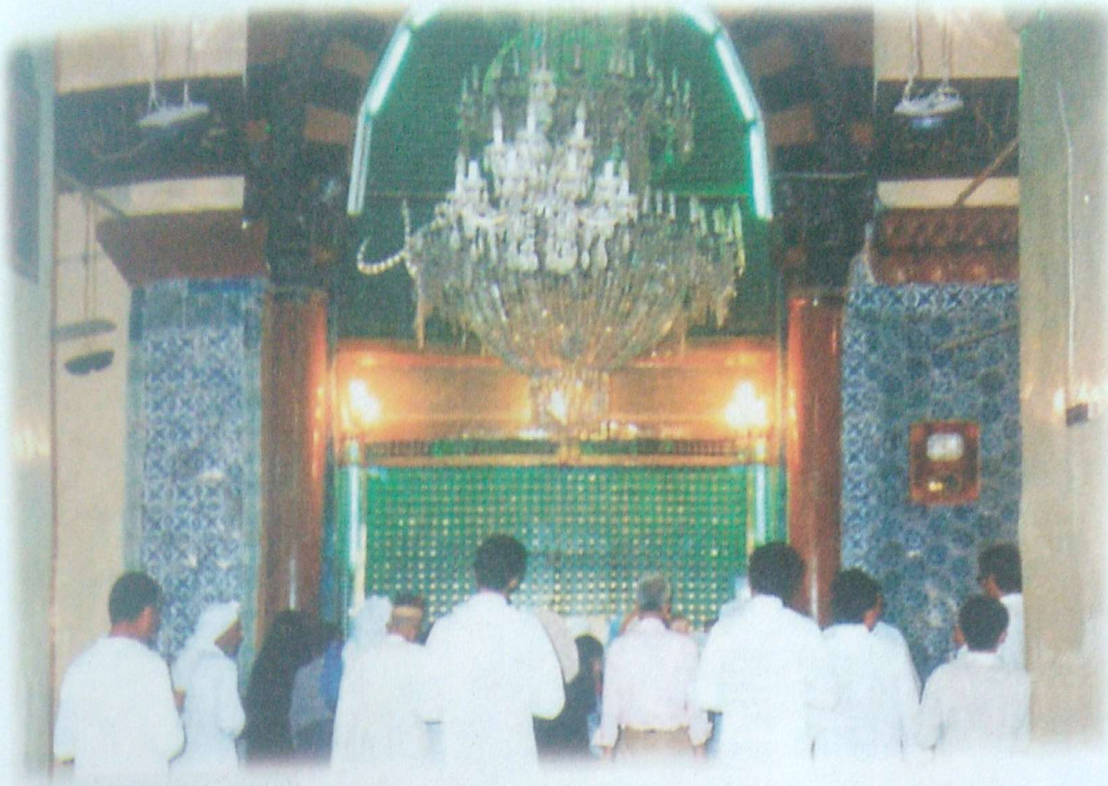
بغداد، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا مزار



بغداد، حضرت سری سقطیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ کے مزارات



بغداد، دجلہ



سوریا (شام)، حلب، جامع ذکریا میں حضرت ذکریاؑ کا مزار



سوریا، دمشق، جامع اُموِی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام (یوحنا) کا مزار جس پر گنبد بنا ہے

سوریا

(شام)

۹ر اگست ۱۹۸۸ء

آج ہم فی کس چار چار اُردنی دینار دے کر دمشق کے لیے ایک کیڈیلیک ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ اردن میں کیڈیلیک اور مرسیڈیز ٹیکسیاں عام ہیں۔ اردن سے خروج کے تین تین دینار، سرحد پر ٹیکس کے ادا کیے۔ پھر شام کی سرحد پر اندراج کے لیے پاسپورٹ دیئے اور دو سو ڈالر کی شامی کرنسی لی، اس کے بغیر شام میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی مصر کی طرح مفلس ملک ہے۔ اس سرحد پر اردن کی آخری آبادی "الرمثاء" اور شام کی پہلی آبادی "دِرعا" ہے۔ دمشق میں سوق الحمیدیہ کے سامنے فُندق بلاط الرشید میں قیام کیا۔ بارہ ڈالر فی یوم دو بستروں کے کمرے کا کرایہ تھا۔ یہاں کے ہوٹلوں میں کرائے کے طور پر شامی کرنسی قبول نہیں کرتے، سعودی ریال یا ڈالر یا یورپین ممالک کی کرنسی قبول کرتے ہیں۔

دمشق کا تلفظ عام طور پر "دِمَشق" کہا جاتا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ دیہات کے لوگ اسے "دِمِشق" کہتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے بھی اسے "عِشق" کا ہم قافیہ قرار دیا ہے۔

چناں قحط سالے شد اندر دِمِشق
کہ یاراں فراموش کردند عِشق

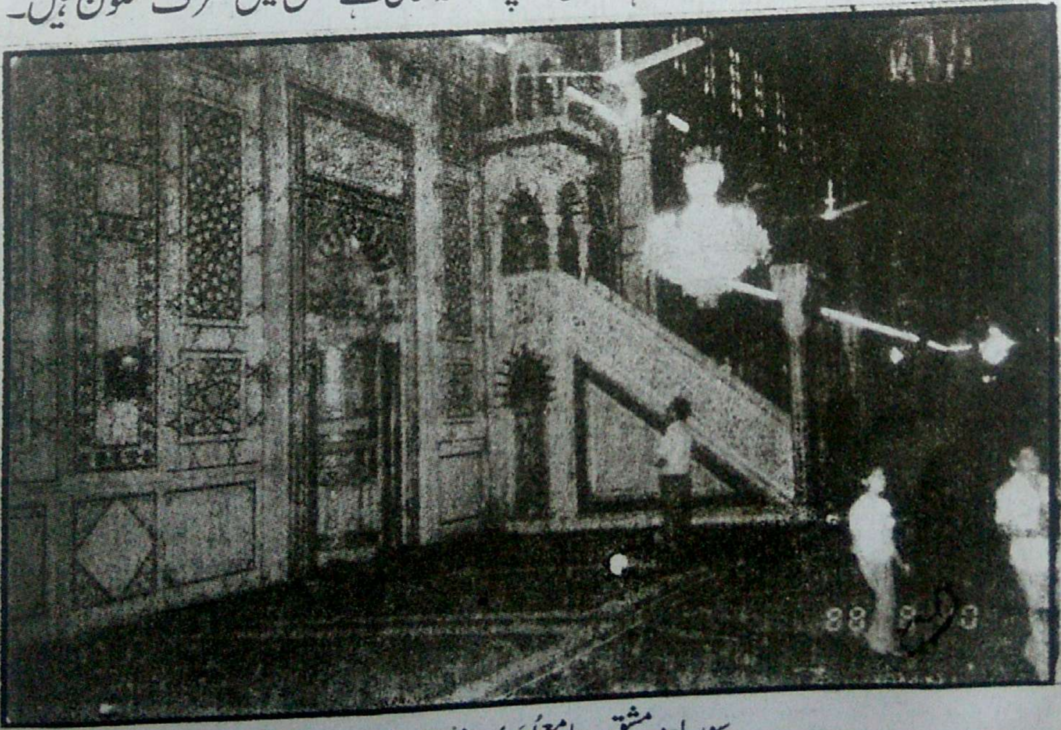
(ایک سال دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق بھی بھول گئے)

امام غزالیؒ نے کتنی نفیس بات فرمائی ہے کہ پیٹ بھرا ہو تو سارے اعضاء بھوکے ہوتے ہیں اور پیٹ خالی ہو تو سارے اعضاء سیر ہوتے ہیں۔

سوق الحمیدیہ چھت والا بازار ہے۔ چھت گولائی لیے ہوئے ہے۔ اس میں سواری نہیں جاتی اور دوکاندار اور خریدار دھوپ اور بارش سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ بازار سلطان عبدالحمید خاں کی طرف منسوب ہے۔ اس کے اطراف میں اور بھی متعدد اسی کی طرح مسقّف بازار ہیں جو مختلف ترک امراء کی طرف منسوب ہیں۔

عصر کے بعد جامع اُموی گئے۔ یہ دراصل حضرت ہود علیہ السلام کے زمانے سے عبادت گاہ ہے۔ مسلمانوں نے جب دمشق فتح کیا تو اس جگہ کنیسہ تھا، جس کی عمارت موجودہ جامع اموی سے بڑی تھی۔ سوق حمیدیہ کی طرف کنیسہ کا مرکزی دروازہ اور اس کے ساتھ کا خاصا میدان اب تک موجود ہے۔ ولید بن عبدالملک نے اسی کنیسہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔

جامع اموی کا طول نسبۃً کم اور عرض بہت ہے۔ مسجد کے صحن کے ایک گوشے میں ایک خوبصورت منقش گول عمارت ہے۔ اس کا نچلا حصہ خالی ہے جس میں صرف ستون ہیں۔



سوریا، دمشق، جامع اُموی، منبر اور محراب



دمشق، جامع اُموی جس گرجا میں ترمیم ۔ رے بنائی گئی اس کا قدیم دروازہ کہ اسے اور ۔ ۔ ۔ تھ کے پچھ
میدان کو مسجد میں شامل نہیں کیا گیا۔

اوپر کے حصے میں گویا دوسری منزل پر ایک گول کمرہ بنا ہوا ہے۔ علحدہ سے سیڑھی لگائے بغیر اس گول کمرے میں نہیں جاسکتے۔ یہ بیت المال تھا۔

جامع اُموی میں قبلہ رخ کھڑے ہوں تو بائیں جانب کے نصف حصے تک فتح کرتے ہوئے حضرت خالد بن ولیدؓ داخل ہوئے تھے اور دائیں جانب کے نصف حصہ تک حضرت ابو عبیدۃ بن الجراحؓ صلحاً داخل ہوئے تھے۔

قبلے کی جانب اس مسجد کے دو مینار ہیں۔ بائیں جانب کا مینار ''منارۂ عیسیٰ'' کہلاتا ہے، جس پر حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے۔

مسجد کا اندرونی حصہ تین چوڑے چوڑے دروں پر مشتمل ہے۔ قبلے کی طرف جو دیوار ہے اس میں بائیں جانب ایک جگہ ''مقام خضر علیہ السلام'' لکھا ہے۔ اس سے ذرا فاصلے پر بائیں جانب ہی دیوار میں ''مقام ہود علیہ السلام'' لکھا ہوا ہے۔ یہ دونوں مقامات دونوں حضرات کی عبادت گاہیں تھیں۔



سوریا، دمشق، [illegible]، قبلہ کی دیوار میں لگا ہوا ایک کتبہ جس پر "هذا مقام نبی الله هود علیه السلام" لکھا ہوا ہے (مقام خضر کے بائیں جانب)

منبر اور مرکزی محراب کے بائیں جانب مسجد کے عرض کے تقریباً درمیانی حصے میں حضرت یحییٰ (یوحنا) علیہ السلام کی قبر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں صرف ان کا سر مدفون ہے۔ واللہ اعلم۔

اس مسجد میں چار محرابیں ہیں۔ قبلہ رخ ہوں تو دائیں جانب کی پہلی محراب مالکیہ کی ہے، دوسری شافعیہ کی، تیسری جو مرکزی محراب ہے اور منبر کے ساتھ ہے حنفیہ کی ہے اور چوتھی حنابلہ کی۔ ان دنوں صرف حنفی اور شافعی امام ہیں اور حنفیہ کی محراب ہی میں نماز پڑھاتے ہیں۔

ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد کے صحن میں پڑھی۔ شیخ عبدالرزاق امام تھے جو حنفی ہیں۔ یہ مغرب کے بعد "در مختار" کا درس بھی دیتے ہیں۔ میں نے درس میں بھی شرکت کی۔ اتنے آہستہ بولتے ہیں کہ قریب کا آدمی بھی بمشکل سن سکے۔

قبلہ کے مخالف سمت میں مسجد سے باہر سلطان صلاح الدین ایوبی کا مزار ہے۔



سوریا، دمشق، صلاح الدین ایوبی

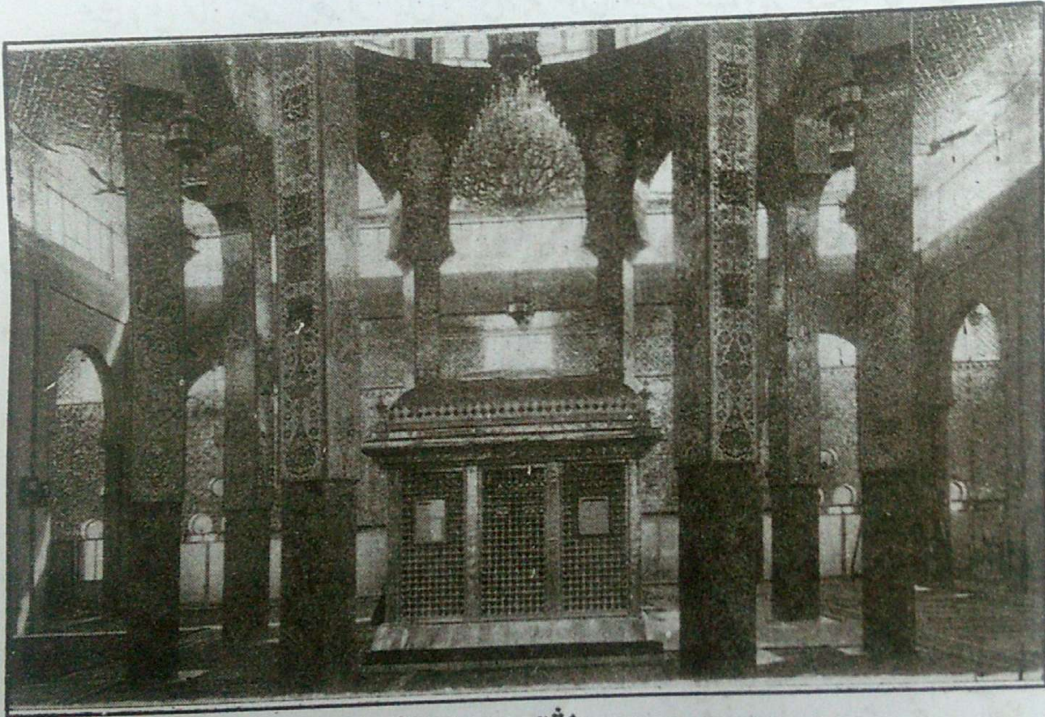
عشاء کی نماز مسجد "منجدار" میں پڑھی، جو سوق حمیدیہ کے باہر قریب ہی واقع ہے۔
نماز کے بعد بالکل اتفاق سے نظر پڑی کہ ایک کمرے کے دروازے پر "مقام بعض صحابۃ الرسول" لکھا ہے۔ کھلوا کر اندر گئے تو چار صحابہ کی قبریں پائیں؛ عباس بن مرداس السلمی، روق بن دثار، خفاف بن ندبہ اور رہبر نے بتایا کہ چوتھی قبر میں دو صحابہ مدفون ہیں جن کے نام معلوم نہیں۔ باقی قبور پر نام لکھے تھے۔ رضی اللہ عنھم اجمعین۔

۱۰/ اگست ۱۹۸۸ء

"مکتبۃ الاسد" گئے جو "ساحۃ الامویین" میں ہے۔ خوبصورت علاقہ ہے اور مکتبہ کی عمارت بھی شاندار ہے۔ "مکتبۃ الاسد" میں مختلف مکتبات کو جمع کر دیا گیا ہے، جن میں "الظاھریہ" بھی شامل ہے۔
مخطوطات کی مطبوعہ فہرست کے لیے ایک صاحب کو تین سو لیرا دیئے، پھر دو گھنٹے تک حماۃ اور حلب کے احمدیہ اور عثمانیہ کی فہرستیں دیکھتا رہا۔ بیوی ایک کونے میں خاموش بیٹھی رہیں۔

اس کے بعد ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے کہا کہ مشہور مقامات دکھادے۔ چناں چہ پہلے تربۃ باب الصغیر گئے اور سیدہ ام کلثوم، سکینہ بنت حسین، فاطمہ صغریٰ، عبداللہ بن جعفر الطیار، میمونہ بنت حسین، ام حبیبہ زوجہ رسولؐ، ام سلمہ زوجہ رسولؐ اور حضرت بلال کے مزارات دیکھے اور ان پر فاتحہ پڑھی۔ شہداء کا مقبرہ بھی دیکھا، جس میں عباس بن علی کا سر، قاسم بن الحسین، علی اکبر بن حسین، عمر بن علی، عبداللہ بن علی، محمد بن علی، عبداللہ بن عوف، محمد بن مسلم، عبداللہ بن عقیل اور حرؓ وغیرہ مدفون ہیں (حرؓ کی قبر کربلا میں بھی ہے، حضرت حسین کے مزار سے کافی فاصلے پر)۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس کے بعد سیدہ زینب گئے۔ وہاں میں نے ایک شیعہ عالم سے دریافت کیا کہ سیدہ زینب کی قبر یہاں بھی ہے اور قاہرہ میں بھی؟ جواب دیا کہ روایات دونوں ہیں لیکن ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہاں ہے۔



سوریا، دمشق، سیدہ زینبؓ

وہاں سے واپس ہوئے تو قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ دمشق کی شہر پناہ اور اس کے متعدد دروازے محفوظ ہیں۔ وہ دروازے بھی محفوظ ہیں جن سے حضرت خالد بن الولیدؓ اور

حضرت ابو عبیدۃ بن الجراحؓ داخل ہوئے تھے۔ قلعہ شہر پناہ کے اندر ہے اور مرمت کی وجہ سے بند تھا۔ اس کے باہر نہر بَرَدیٰ کے کنارے حضرت ابو درداءؓ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔

قدیم دمشق جو شہر پناہ کے اندر ہے اس میں ایک محلہ ہے "حَيّ قَيمَرِيَّةُ النَّقَّاشات"، اس میں زیادہ تر شیعہ آبادی ہے۔ اسی میں حضرت معاویہؓ کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے کے پاس ایک مکان کے اندر سے ہو کر جاتے ہیں، جس کا مالک ایک شیعہ ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر صاحبِ مکان باہر آئے۔ دریافت کرنے پر ہم نے بتایا کہ پاکستانی ہیں۔ کہا کہ داخلے کے پندرہ لیرا لیں گے۔ چناں چہ پندرہ لیرا دے کر اندر داخل ہوئے اور گنبد کے نیچے کھڑکی میں سے حضرت معاویہؓ کی پختہ قبر دیکھی، جس پر گرد و غبار تھا، کوئی نقش و نگار تھا نہ چادر۔ اسی گنبد میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی بعض اولاد کی قبور بھی ہیں۔ یہ قبور زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں :

برمزارِ ماغریباں نے چراغ و نے گلے
نے پرے پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

جو عورت ہمیں بتا رہی تھی وہ حضرت معاویہؓ پر مسلسل لعنت بھی بھیجتی رہی۔

مغرب کی نماز جامع اموی میں پڑھی اور واپسی میں حضرت ابو ہریرہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ سوق الحمیدیہ میں داخل ہوں اور رخ جامع اموی کی طرف ہو تو دائیں جانب کی پانچ دوکانوں کے بعد ذرا اندر کو ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو جامع ابی ہریرۃ کہلاتی ہے۔ اسی میں ایک طرف قبر ہے اور کتبہ لگا ہوا ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ یہ صحابیٔ رسول حضرت ابو ہریرہ کی قبر ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ حضرت ابو ہریرۃؓ جن کا نام عبد الرحمٰن بن صخر تھا، کا انتقال ۵۹ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا ہے اور وہیں مدفون ہیں۔

۱۱ر اگست ۱۹۸۸ء

(دمشق) صبح مکتبۃ الاسد گئے اور کچھ وقت وہاں گذارا۔ اس کے بعد وہ ڈرائیور آگیا

جس سے آج کی سیر طے کی تھی۔ سوا گیارہ بجے سیر کے لیے روانہ ہوئے اور تقریباً تین بجے واپس آئے۔ کل کی طرح آج بھی ڈرائیور کو پانچ سو سوری لیرا دیئے۔

سب سے پہلے جبلِ قاسیون گئے اور اصحابِ کہف کا غار دیکھا۔ غار کے کچھ حصے تک اندر جاتے ہیں۔ بتایا گیا کہ غار مزید اندر چھ میٹر تک ہے جسے دیوار قائم کر کے بند کر دیا گیا ہے۔



سوریا، دمشق، جبل قاسیون میں "اصحابِ کہف"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف اردن میں ہیں جہاں ان کی ہڈیاں اور کتے کے سر کی ہڈی بھی کھدائی میں برآمد ہوئی ہے اور پختہ کتبے پر کندہ کیا ہوا بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اس کے بعد حضرت ہابیل، جنہیں یہاں عام طور پر "نبی ہابیل" کہا جاتا ہے، کی قبر کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے جو دمشق سے اوسطاً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ پہاڑی مقام اور فوجی ایریا ہے، جابجا فوجی چوکیاں ہیں۔ پہلی چوکی ہی پر سپاہی نے ڈرائیور سے اس کا شناختی کارڈ اور مجھ سے کیمرہ رکھوالیا اور اس کے آگے بھی تین جگہ پوچھا گیا کہ کیمرہ تو ساتھ نہیں ہے؟

حضرت ہابیل کے مزار پر گنبد ہے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے خوبصورت نہیں۔ اس پر سفید رنگ کیا ہوا ہے۔ اندر تقریباً چھ میٹر لمبی پختہ قبر ہے۔ وہاں بہت سے زائرین موجود تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہاں عام طور پر "دروز" آتے ہیں جو حضرت ہابیل کو نبی مانتے ہیں۔

دروز کے بارے میں ڈرائیور نے بتایا کہ جب تک ان کی عمر چالیس سال کی نہ ہو جائے انہیں خود پتہ نہیں ہوتا کہ ان کا مذہب کیا ہے۔ چالیس سال ہونے پر اسے اپنے مذہب کا راز بتایا جاتا ہے، پھر وہ کسی سے نہیں کہتا۔

"نبی ہابیل" سے واپس آکر زیدانی کی طرف اس مقام پر گئے جہاں "نہر بَرَدیٰ" کا منبع ہے۔ یہ منبع جبل شیخ کے دامن میں ہے۔ وہیں سے پانی اس طرح نیچے سے ابل رہا ہے کہ ابلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کا پانی بھی پیا، خاصا ٹھنڈا پانی تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ جبل شیخ کا پورا طویل سلسلہ سردیوں میں برف سے ڈھک جاتا ہے۔ وہاں سے واپس اس راستے سے ہوئے جو "نہر بردی" کے کنارے کنارے پہاڑ کے دامن میں اوپر سے جاتا ہے۔ نہر بردی کی وادی درختوں خصوصاً "حُور" کے درختوں سے اس طرح بھری ہوئی ہے کہ بعض جگہ شاید سورج کی روشنی بھی بمشکل پہنچتی ہو۔ حُور کا درخت بالکل سیدھا سفیدی مائل ہوتا ہے اور اس کی لکڑی عمارتوں میں استعمال ہوتی ہے۔

۱۴ / اگست ۱۹۸۸ء

تین ہزار لیرا میں ایک ٹیکسی طے کی اور اس پر حلب تک گئے۔ رات کو ۹ بجے کے قریب واپس آئے۔ ڈرائیور کو مزید دو سو لیرا دیئے۔

حمص سے پہلے ڈرائیور نے بائیں جانب کے پہاڑی سلسلے کے بارے میں بتایا کہ اس کے دوسری جانب لبنان کا علاقہ ہے اور وہ سڑک بھی بتائی جو بعلبک کی طرف جاتی ہے، جس پر اجازت کے بغیر کوئی نہیں جاسکتا۔ نَبَک، دَرعطیہ اور قارہ وغیرہ کی آبادیوں سے گذرتے ہوئے پونے نو بجے حمص پہنچے۔ دمشق سے حمص تقریباً ۱۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ سیدھے جامع خالد بن ولید گئے۔ بلند زمین میں کافی کشادہ میدان میں یہ خوبصورت مسجد بنی



سوریا، حمص، مسجد خالد بن الولیدؓ

ہے۔ ہم نے تحیۃ المسجد پڑھ کر اولاً حضرت خالدؓ کے اور پھر حضرت عبید اللہ بن عمرؓ کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ رہبر نے بتایا کہ ملک ظاہر بیبرس کے عہد میں کھدائی ہوئی تو حضرت عبید اللہؓ کی پیشانی پر تیر کا زخم تھا اور اس سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔ واللہ اعلم۔

اس مسجد میں خوبصورت ڈاڑھیوں والے متعدد نوجوان ملے جنھوں نے میری سفید لمبی ڈاڑھی دیکھ کر مجھے کوئی بزرگ سمجھا اور مصافحے کر کے ہاتھ چومے۔

حمص سے حماۃ ہوتے ہوئے "مَعَرّۃُ النُّعمان" پہنچے۔ خاص طور پر حماۃ سے حلب تک پوری زرعی زمین ہے اور میلوں تک بادام، زیتون، انگور، تربوز اور مختلف پھلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ ہم نے تازہ سیاہ انگور خرید کر کھائے جو اس طرح کی جھاڑی میں لگتے ہیں جیسے جنگلی بیر یا کگرونڈے کی جھاڑی۔

معرۃ النعمان میں ہم نے ابو العلاء المعری کی قبر دیکھی۔ معری کی قبر مرکز ثقافی کے اندر ہے۔ مرکز ثقافی کے مدیر کے کہنے پر میں نے وزٹرس بک میں یہ لکھا: "سلامی۔ کباستانی۔ لأهل الشام وأدعوا الله أن يغلب المسلمين على الكفار فی كل مكان"۔

مرکز ثقافی کے مدیر نے بتایا کہ معری یہیں پیدا ہوا، یہیں اس کا مدرسہ تھا اور یہیں اس کا انتقال ہوا۔ قبر کی قبلے کی دیوار پر معری کا یہ شعر کندہ تھا:

هذا ماجنی أبی علی وما جنیت علی احد۔

سولبارہ کے قریب حلب کی "جامع زکریا" (جسے "الجامع اموی" اور "الجماع الکبیر" بھی کہتے ہیں) پہنچے اور وہاں جمعہ کی نماز پڑھی۔ امام صاحب کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہو گی، خشخشی ڈاڑھی تھی۔ نئے سال ہجری کی مناسبت سے جو سنیچر سے شروع ہونے والا تھا، بڑی زوردار تقریر کی اور نماز کے بعد کھڑے ہو کر حسبنا الله ونعم الوکیل کا زور زور سے ورد کیا اور کرایا۔ پھر مختصر تقریر اور دعا کی۔

نماز کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام کے مزار پر حاضری دی۔ یہ مزار محراب کے قریب ہی، دائیں جانب کی دیوار میں ایک حجرے میں ہے۔ صلاۃ و سلام پڑھا۔

دمشق کے مقابلے میں حمص اور حماۃ اور حلب میں دینداری اور پردہ زیادہ دیکھا۔ حلب میں جمعے کی نماز کے بعد ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ یہ دو بچے گونگے ہیں، ان پر کچھ پڑھ کر پھونک دو۔ نماز کے بعد حلب کا قلعہ دیکھا۔ رومی دور کا بڑا شاندار قلعہ ہے۔ خاص طور پر اس کا دربار کا کمرہ اب تک بڑا خوبصورت اور نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ اس کے بعد کھانا خریدا اور ڈرائیور کی بہن کے گھر جا کر اس آبادی میں کھایا جہاں فلسطینی آباد ہیں اور غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ آبادی حلب سے کافی دور ہے۔ ڈرائیور حسن احمد منصور نے بتایا کہ سب لوگ فلسطین کے مسئلے کو سیاسی اور مالی اغراض کے تحت ایکسپلائٹ کر رہے ہیں، کوئی بھی فلسطین اور فلسطینیوں کے ساتھ مخلص نہیں۔

جیسا کہ ڈرائیور نے بتایا حلب رقبہ میں دمشق سے بڑا لیکن آبادی اس سے بہت کم ہے۔

سیف الدولہ اور متنبّی کی وجہ سے حلب، طلبِ علم کے دور ہی سے میرے ذہن میں تھا۔



سوریا، حلب ن یب خوبصورت بد

۱۳/ اگست ۱۹۸۸ء

آج دوبارہ سلطان صلاح الدین ایوبی ی قبر پر جالر فاتحہ پڑھی۔ فاتحہ پڑھتے ہوئے کچھ آنسو بھی بہائے اور دعا کی کہ اے اللہ! عالمِ اسلام کو پھر ایک صلاح الدین عطا فرمادے۔

اس کے بعد قصر عظم کا میوزیم، پھر حربی میوزیم اور اس کے بعد ''المتحف الوطنی'' یعنی نیشنل میوزیم دیکھا۔ پہلے دونوں میوزیم تو نام کے ہیں البتہ آخر الذکر میں خاصے آثار ہیں۔

شام کو ٹیکسی لی اور غُوطہ کی طرف نکل گئے۔ یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ غوطہ نہ آتے تو دمشق کی سیر ادھوری رہ جاتی۔ بہت سرسبز و شاداب، خوبصورت جگہ ہے۔ میلوں تک سیب، ناشپاتی، بادام، انجیر، اسٹرابری وغیرہ کے درخت ہیں اور حُور کے درخت کے جنگل کے جنگل اس قدر گھنے کھڑے ہیں کہ بعض مقامات پر سورج کی روشنی کا داخلہ بھی شاید ممنوع ہو۔ خاص طور پر حُور کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے لمبے لمبے درختوں کی شاخیں سڑک کے اوپر میلوں تک اس طرح ملی ہوئی تھیں گویا محراب بنی ہو اور ہم اس کے گھنے سائے میں سے گذر رہے تھے۔ غُوطہ کی سیر کے بعد مغرب سے پہلے جامع اموی پہنچ گئے اور حضرت

یحییٰ علیہ السلام کے مزار پر نہمتی صلاۃ و سلام پڑھا۔

شام کے لوگ عام طور پر بااخلاق ہیں۔ یہ ایک غریب ملک ہے، لیکن یاد نہیں کہ کسی کو بھیک مانگتے دیکھا ہو۔ کہیں کہیں نابینا کھڑے ہوتے ہیں، لیکن ان کے ہاتھوں میں بھی فروخت کرنے کے لیے سگریٹ کے پیکٹ یا کوئی دوسری چیز ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہاں بھیک مانگنا قانوناً جرم ہو۔

پرانا دمشق تو بہت گنجان آباد ہے اور اس میں صفائی کا اتنا اہتمام نہیں، لیکن نیا دمشق خوبصورت ہے، سڑکیں بھی کشادہ اور صاف ستھری ہیں اور دورویہ درخت بھی ہیں۔

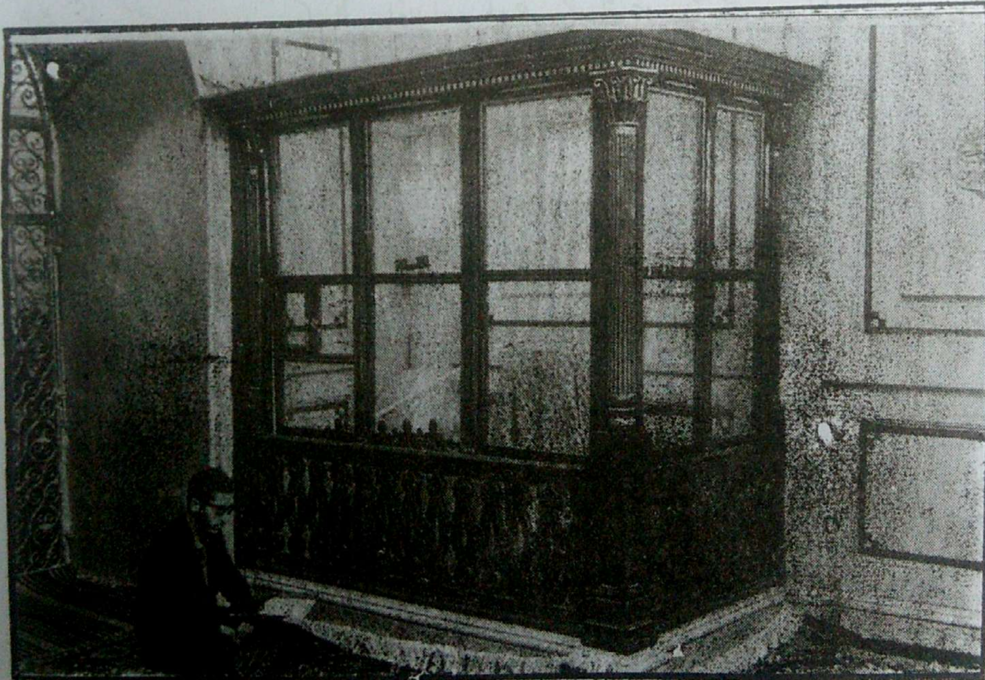
جگہ جگہ حافظ اسد کے فوٹو لگے ہوئے ہیں اور دمشق میں اور دمشق سے باہر متعدد مقامات پر حافظ اسد کے اسٹیچو بنے ہوئے ہیں اور جابجا لکھا ہوا ہے : رئیسنا إبی الأبدالحافظ أسد اور کہیں کہیں الرئیس المناضل لکھا ہوا ہے۔

سوریا کی حدود میں ہم جب داخل ہوئے تو یہ نعرہ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا : "الاتحاد، الاشتراکیة، الحریة"۔ اسلام کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ہمیں شام میں ہپی طرز کا کوئی شامی نظر نہیں آیا، سب کے بال حافظ اسد کی طرح کٹے ہوئے تھے۔ یہ بھی محسوس کیا کہ یہاں لوگ سگریٹ بکثرت پیتے ہیں۔

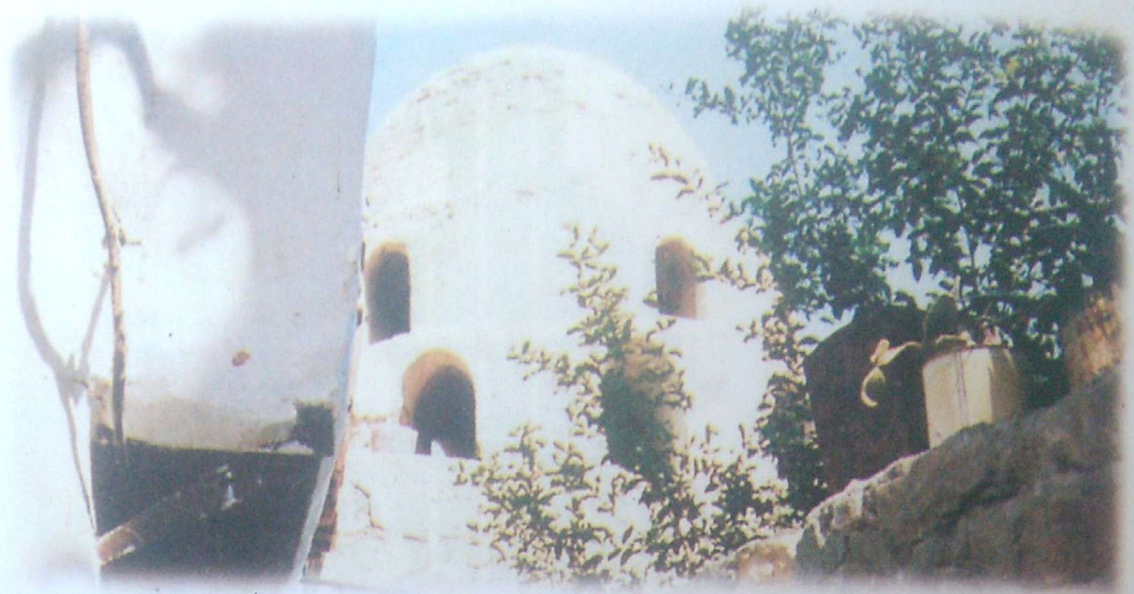
دمشق اور حلب میں دیکھا کہ اذان کے بعد الصلاة والسلامُ علیك اور پھر ذرا وقفے سے یاسیدی یارسول الله کہتے ہیں اور اردن میں اذان کے بعد الصلاة والسلام علی محمد وآلہٖ وصحبہٖ وسلم کہا جاتا ہے اور اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں اہلِ سنت کی مساجد میں اذان سے پہلے جو "الصلاة والسلام علیك یا رسول الله" اور "یا جبیب الله" کہا جاتا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ممکن ہے کسی مسلم ملک میں اذان سے پہلے بھی "صلاۃ و سلام" پڑھنے کا رواج ہو، میں نے سارے مسلم ممالک تو دیکھے نہیں۔

۱۱ بجے کے قریب اردن کے لیے روانہ ہوئے۔ بس اسٹاپ پر کوئی ٹیکسی موجود نہ تھی اور ایک بس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ہم نے پونے دو سو لیرا فی کس کے حساب سے دو

ٹکٹ لیے اور بس میں سوار ہوئے۔ وہ تیار بس بھی تقریباً پون بجے روانہ ہوئی اور ہم تقریباً دس بجے عمان پہنچے۔ شام جاتے وقت ٹیکسی سے گئے تھے، نہ سامان چیک ہوا تھا اور نہ پاسپورٹ۔ خروج اور دخول کے اندراجات میں چنداں دشواری ہوئی تھی، لیکن بس میں مذکورہ امور میں بڑی دشواری ہوئی۔ توبہ کی کہ اگر آئندہ مشرقی ممالک میں سفر کا اتفاق ہوا تو ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر بس سے نہیں کریں گے۔



سوریا، دمشق، وہ مقام جہاں حضرت حسینؓ کا سر مدفون ہے (جیسا کہ مشہور ہے)



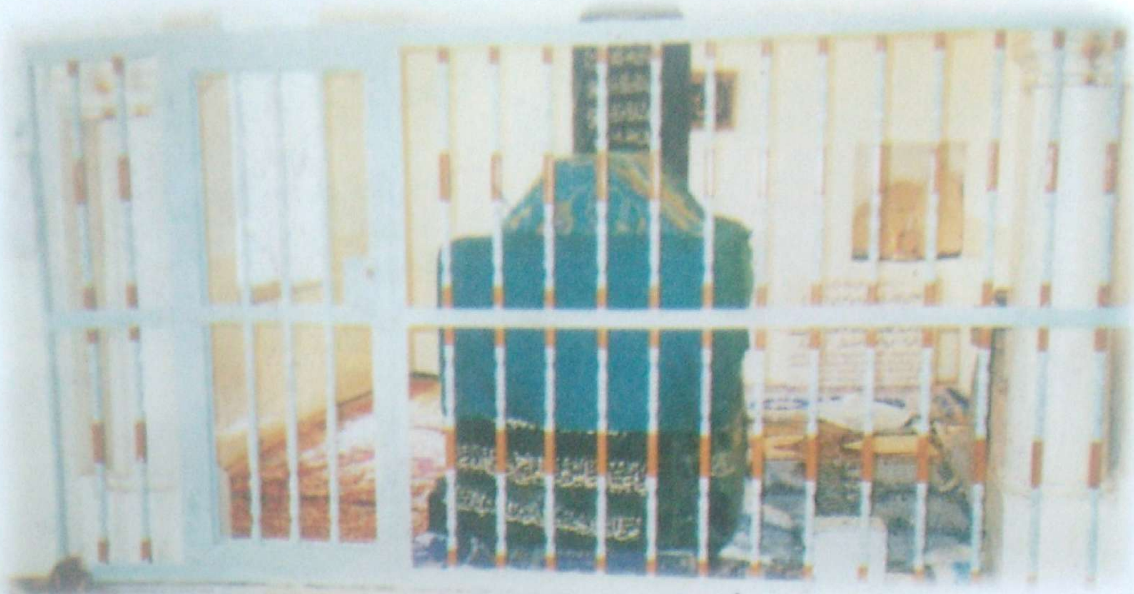
سوریا، دمشق، حَی قَیُمَرِیَّةُ النَّقّاشَات میں حضرت امیر معاویہؓ کے مزار کا گنبد



سوریا، دمشق، جامع اُمَوِی، دائیں جانب بیت المال کی عمارت، درمیان میں صدر دروازہ، بائیں جانب وہ منار جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے



سوریا، حمص، مسجد حضرت خالد بن الولیدؓ اور اندر مزار



اردن، غور، حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کا مزار



اردن، بترا، خزانہ



اردن، عمان، ایک قبر میں اصحابِ کہف کی ہڈیاں

اردن

۷ر اگست ۱۹۸۸ء

دو بجے دن کی سعودیہ کی فلائٹ سے میں اور بیوی جدہ سے عمان کے لیے روانہ ہوئے اور عمان پہنچ کر "هلا اِن" ہوٹل میں گیارہ دینار (تقریباً پانچ سو پچاس روپے پاکستانی) یومیہ میں قیام کیا۔

۸ر اگست

عمان شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع "اصحابِ کہف" دیکھنے گئے۔ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر جو زیادہ بلند نہیں ہے، وہ غار ہے جو "اصحابِ کہف" کے نام سے معروف ہے۔



اردن، اصحابِ کہف کے غار کے نیچے سلطان صلاح الدین کی مسجد کے کھنڈرات

غار سے باہر پتھر پر کندہ ایک کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔ نیچے ایک قدیم مسجد کے آثار ہیں۔ مجاور نے بتایا کہ یہ صلاح الدین ایوبی کی تعمیر کردہ مسجد ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ مسجد صلاح الدین نے اسی مسجد کی جگہ بنائی ہو جس جگہ اصحاف کہف کے ہوش میں آکر ظاہر ہونے اور دوبارہ دائمی نیند کی آغوش میں جانے کے بعد اُس زمانے کے لوگوں نے عبادت خانہ بنایا تھا اور جس کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَى أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا (بولے وہ لوگ جن کا کام غالب تھا کہ ہم اس جگہ ایک عبادت خانہ بنائیں گے)۔ اسی مسجد کے پیچھے ذرا سی بلندی پر غار ہے۔ مجاور نے تالا کھول کر غار میں داخل کیا۔ دائیں اور بائیں جانب چار چار قبریں ہیں۔ مجاور نے بتایا کہ بائیں جانب کی قبروں میں سے ایک قبر کتے کی ہے۔ درمیان میں خالی جگہ ہے جسے مجاور کے قول کے مطابق قرآن کریم میں



اردن، اصحابِ کہف، غار میں داخل ہوں تو کتے کی شامل کر کے آٹھ قبریں (چار دائیں اور چار بائیں جانب)

"فجوۃ" (وسیع حصہ) کہا گیا ہے۔ غار میں ایک جانب کی قبروں کے اوپر ایک سوراخ ہے، جس سے روشنی آتی ہے۔ مجاور نے بتایا کہ پہلے قبروں کے اوپر شیشے لگے ہوئے تھے اور اصحابِ کہف کے ڈھانچے نظر آتے تھے، لیکن اب ساری ہڈیاں نکال کر ایک قبر میں جمع کر دی

گئی ہیں اور تمام قبروں کے اوپر سے شیشے اتار کر انہیں پاٹ دیا گیا ہے۔ جس قبر میں یہ ہڈیاں جمع کی گئی ہیں اس میں ایک بڑا سا سوراخ بھی رکھا گیا ہے جس سے ہڈیاں نظر آتی ہیں۔ مجاور نے مجھ سے کیمرہ لے کر ان ہڈیوں کا فوٹو کھینچ دیا۔

"فجوۃ" سے ذرا آگے اس سے متصل ہی غار میں ایک کمرہ سا ہے۔ اس میں ایک الماری میں مختلف چیزیں رکھی ہیں جو وہاں کھدائی میں برآمد ہوئی ہیں۔ ان میں جانور کی ایک کھوپڑی بھی ہے۔ مجاور نے بتایا کہ اصحابِ کہف کے کتے کی کھوپڑی ہے۔ واللہ اعلم۔



اردن، اصحاب کہف ۔۔۔ یہ جو کھدائی میں برآمد ہوئیں انہی میں کتے کے سر کی ہڈی بھی ہے

قرآن کریم میں ہے:

أم حسبت ۔ صحابِ الکھف والرقیم کانوا من آیاتنا عجباo

بعض مفسرین اصحابِ کہف (غار والے) اور اصحابِ رقیم (رقیم والے) کو ایک ہی لکھتے ہیں اور بظاہر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ غار کو تو کہف کہتے ہیں، اس علاقے کو بھی جس میں یہ غار واقع ہے "رجیب" کہا جاتا ہے اور "رجیب" "رقیم" ہی ہے، کیوں کہ 'ب' کا 'م' سے بدل جانا بعید نہیں، اس لیے کہ دونوں ہم مخرج ہیں اور اردن اور بغداد میں 'ق' کا تلفظ

'ج' سے کیا جاتا ہے۔ بغداد کے ایک علاقے کو "باب الشرقی" کے بجائے "باب الشرجی" کہا جاتا ہے۔ 'ق' کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ سعودی اس کا تلفظ 'گ' کی طرح کرتے ہیں؛ "قل" کو "گل" کہتے ہیں۔ میں نے ایک بار ایک قصائی سے دریافت کیا کہ "هل عندك مقاديم؟" (کیا تمہارے پاس پائے ہیں؟)۔ اس نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ تلفظ صحیح کیا کرو، "مگادیم" کہو۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

مصری اس کا تلفظ "أ" (ہمزہ) سے کرتے ہیں، "حقيقة" کو "حئيئة" کہتے ہیں۔ ایک لطیفہ بھی ہے کہ "رحتُ إلى السوق واشتريتُ القلم" (میں بازار گیا اور قلم خریدا)۔ اسے مصری اس طرح بولتے ہیں: "رحتُ إلى السوء واشتريتُ الألم" (اب اس کا ترجمہ یوں ہوگا: میں بری جگہ گیا اور رنج والم خریدا)۔

شاید 'ق' کا معاملہ عجیب ہونے کی وجہ سے ہی قرآن کریم میں 'ق' کے نام سے ایک مستقل سورۃ بھی ہے۔ شیخ عبدالعزیز دباغ کی کتاب "الابریز" میں 'ق' کے عجائبات پر کئی صفحات لکھے ہوئے ہیں۔

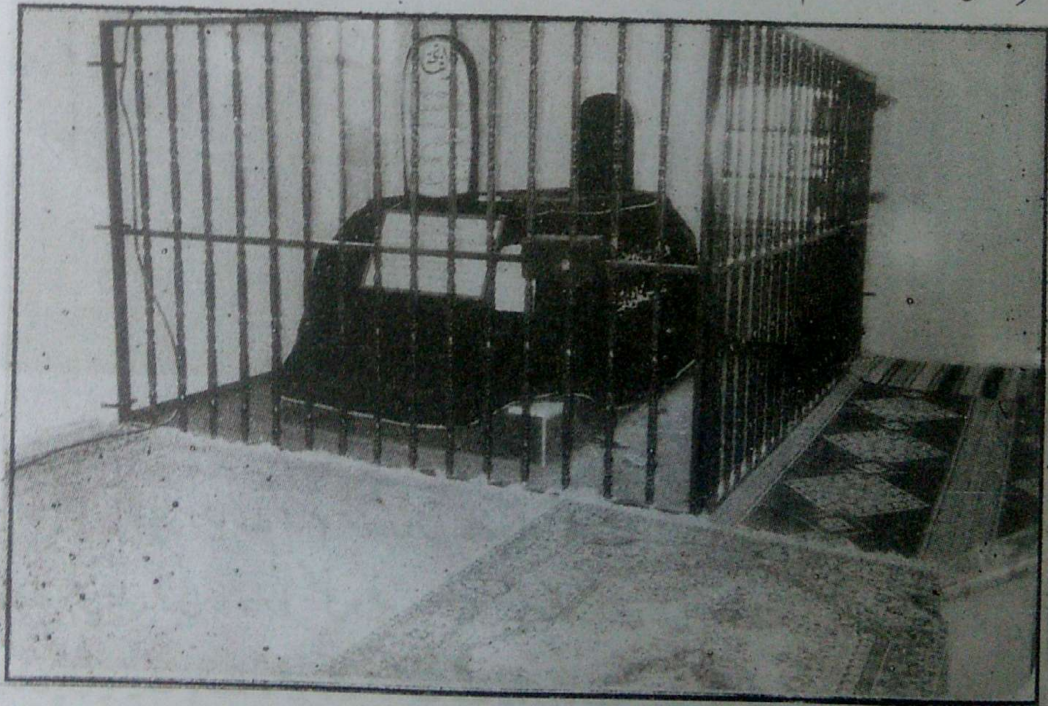
بہر کیف زیادہ صحیح یہی نظر آتا ہے کہ اصحابِ کہف اردن ہی میں ہیں، دمشق کے "جبلِ قاسیون" میں نہیں (جس کا ذکر شام کے سفر کے ضمن میں ہے)۔ اصحابِ کہف کی زیارت سے فارغ ہو کر "جرش" چلے گئے، جہاں رومانی عہد کے عظیم تاریخی آثار ہیں۔

ہوٹل واپس آکر قدرے آرام کیا اور مغرب سے قبل "جبلِ حسین" (جس پر شاہی محلات ہیں) ہوتے ہوئے مسجد حسین گئے اور وہاں مغرب کی نماز ادا کی۔ مسجد حسین جاتے ہوئے راستے میں رومانی دور کے قلعے کے اوپر بھی گئے اور اوپر سے نیچے کا خوبصورت "مُدَرَّج" (تھیٹر) اور "ساحة ہاشمیہ" دیکھا۔ مغرب کے بعد فُندق قدس میں چار دینار میں کھانا کھایا (تقریباً دوسو روپے پاکستانی)۔

اس کے بعد ۹ر سے ۱۳؍ اگست ۱۹۸۸ء تک کا عرصہ شام میں گذرا۔

شام سے ۱۴؍ اگست کو اردن آ گئے تھے۔ آج ہم نے ایک ٹیکسی سے غور، بحر میت اور نبی شعیب کے سفر کا بائیس دینار میں معاملہ کیا اور گیارہ بجے کے قریب روانہ ہو گئے۔ غور جاتے ہوئے صُوَیلِحْ سے گذرے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہاں قفقاز (روسی علاقے میں) کے شَرَکس آباد ہیں، جو آپس میں قفقازی زبان بولتے ہیں جسے "شَرَکَسِیَہ" کہا جاتا ہے اور اردنیوں سے عربی میں بات کرتے ہیں۔ یہ اردن کے قدیم باشندے ہیں اور اردنی سلطنت کے بانیوں میں سے ہیں، اسی لیے ملک حسین کے دادا سے لے کر آج تک کے تمام بادشاہ ان کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔

ساڑھے بارہ بجے غور میں اس جگہ پہنچے جو منطقۂ ابو عبیدہ کہلاتا ہے اور بقول ڈرائیور عمان سے ۶۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں اسلام کے عظیم سپہ سالار حضرت ابو عبیدۃ بن الجراحؓ کے نام کی مسجد ہے اور اسی مسجد میں حضرت ابو عبیدہ کا مزار ہے۔ تحیۃ المسجد پڑھ کر فاتحہ پڑھی اور ظہر کی نماز باجماعت پڑھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ اگرچہ جاتے وقت ہی منطقہ ضُرار ابن الازورؓ کے نام کی تختی دیکھ لی تھی، لیکن وہاں واپسی میں اترے اور حضرت ضرارؓ کی قبر



اردن، غور، حضرت ضرار ابن الازورؓ

Scanned by CamScanner

پر فاتحہ پڑھی۔ یہ مزار حضرت ابو عبیدہؓ کے مزار سے دو تین کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔

حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت ضرارؓ کے مزارات سے تقریباً دو کلو میٹر کے فاصلے پر "نہرِ یرموک" اور تقریباً چار کلو میٹر کے فاصلے پر "نہرِ اردن" ہے۔ یہ دونوں دراصل دریائے یرموک ہی کی دو شاخیں ہیں، جیسا کہ ڈرائیور نے بتایا۔ دریائے اردن اسرائیل اور اردن کے درمیان حدِ فاصل ہے اور اس دریا پر بنا ہوا "جسر الحسین" اردن اور اسرائیل کو ملاتا ہے۔

دو بجے کے قریب بحر میت پہنچے۔ جو سڑک بحر میت کی طرف مڑتی ہے اس پر فوجی پہرہ تھا۔ فلسطین اور اردن کے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا یہ تالاب جیسا سمندر نما حصہ بحر میت کہلاتا ہے۔ اس کا کسی سمندر سے اتصال نہیں اور دریائے اردن اسی میں گرتا ہے۔



اردن، بحر میِّت جسے بحرِ لوط بھی کہا جاتا ہے۔ غروبِ آفتاب کا منظر

اس کا پانی دنیا کے تمام سمندروں سے زیادہ کھاری ہے۔ ہم نے چکھا بھی، تقریباً کڑوا ہے۔ اس میں کوئی جاندار (مچھلی وغیرہ) نہیں پایا جاتا۔ اس میں نوے فیصد نمک ہے اور آدمی یہاں پانی پر لیٹ جائے تو بغیر کچھ حرکت کئے لیٹا رہتا ہے، ڈوبتا نہیں۔ ہم نے خود ایک انگریز

سیاح کو اس طرح لیٹے دیکھا۔ یہاں یورپین سیاح مرد اور عورتوں کی عریانی نے میامی کا ساحل یاد دلا دیا۔ بحر میت میں جہاز بھی نہیں چلتے، کیوں کہ یہ پانی لوہے کو جلد گلا دیتا ہے۔ بحر میت کو بحر لوط بھی کہتے ہیں۔

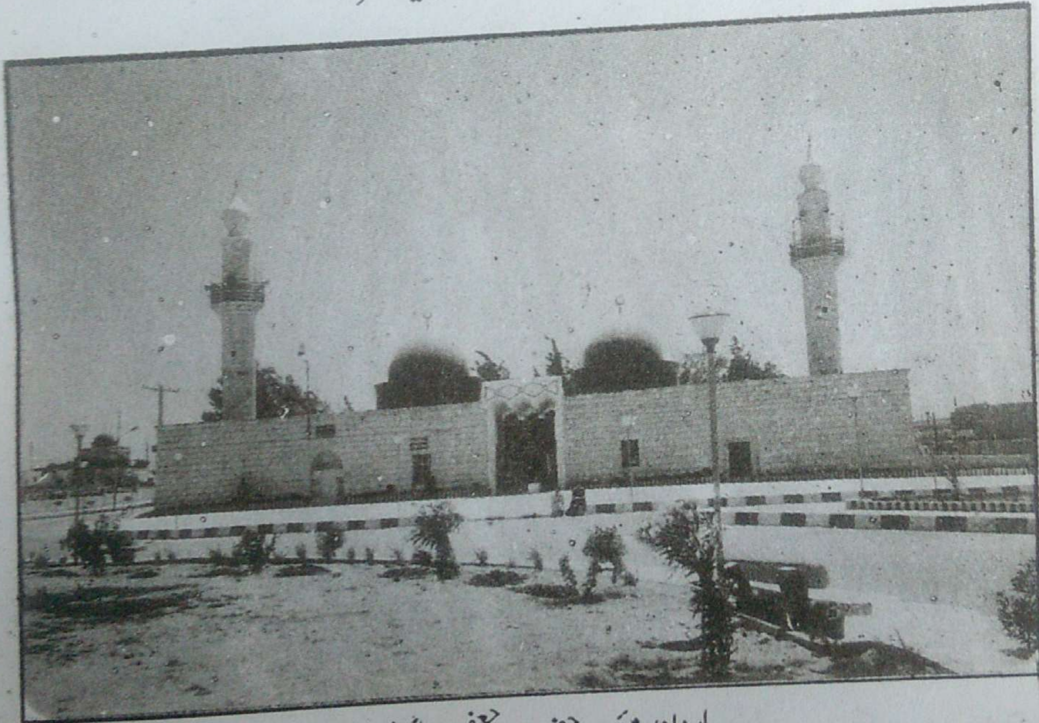
بحر میت سے "نبی شعیبؑ" کی طرف روانہ ہوئے جو عمان سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار ایک پہاڑی پر ہے۔ یہ فوجی علاقہ ہے جہاں پریڈ کے لیے فوجی جمع تھے۔ کیمرہ گیٹ پر ہی رکھوا لیا گیا۔ ہم مزار پر پہنچے اور صلاۃ و سلام پڑھا۔ مزار تقریباً سات میٹر لمبا ہے۔ سبز چادر پڑی تھی اور مزار کا بالائی حصہ ایسا تھا جیسے کشتی سے بنا ہو۔ شام میں حضرت ہابیل کی قبر کی لمبائی (جس کا ذکر شام کے سفر کے ضمن میں ہے) تو قابل تعجب نہیں، کیوں کہ وہ براہِ راست حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں اور حضرت آدمؑ کا قد صحیح حدیث کی رو سے ساٹھ ہاتھ (تقریباً نوے فٹ) تھا، لیکن حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر کی لمبائی کی اگر یہ تاویل کی جائے کہ ان کا قد اتنا لمبا تھا تو یہ قابل قبول نہیں، کیوں کہ انہی کے ہم عصر فراعنہ کی حنوط شدہ لاشیں اب تک محفوظ ہیں، جن کے قد ہم جیسے ہی ہیں۔

۱۶/ اگست ۱۹۸۸ء

عمان کے بس اسٹاپ (مُجمَّع جنوبی) "الشرق الاوسط" سے تقریباً دس بجے بس میں کَرَک کے لیے روانہ ہوئے اور بارہ بجے کے قریب "کرک" پہنچے۔ اردن کے عام شہروں کی طرح کرک بھی پہاڑ پر واقع ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک بڑا قلعہ ہے۔ دوپہر کا وقت ہونے کے باوجود ہوا میں قدرے خنکی تھی۔ وہاں سے ہم نے مُؤتہ کے لیے تین دینار میں آنے جانے کے لیے ٹیکسی کی۔ سب سے پہلے حضرت جعفر طیارؓ کی مسجد میں پہنچے۔ تحیۃ المسجد پڑھ کر مزار پر فاتحہ پڑھی۔



اردن، موتہ، حضرت جعفر طیارؓ، مزار

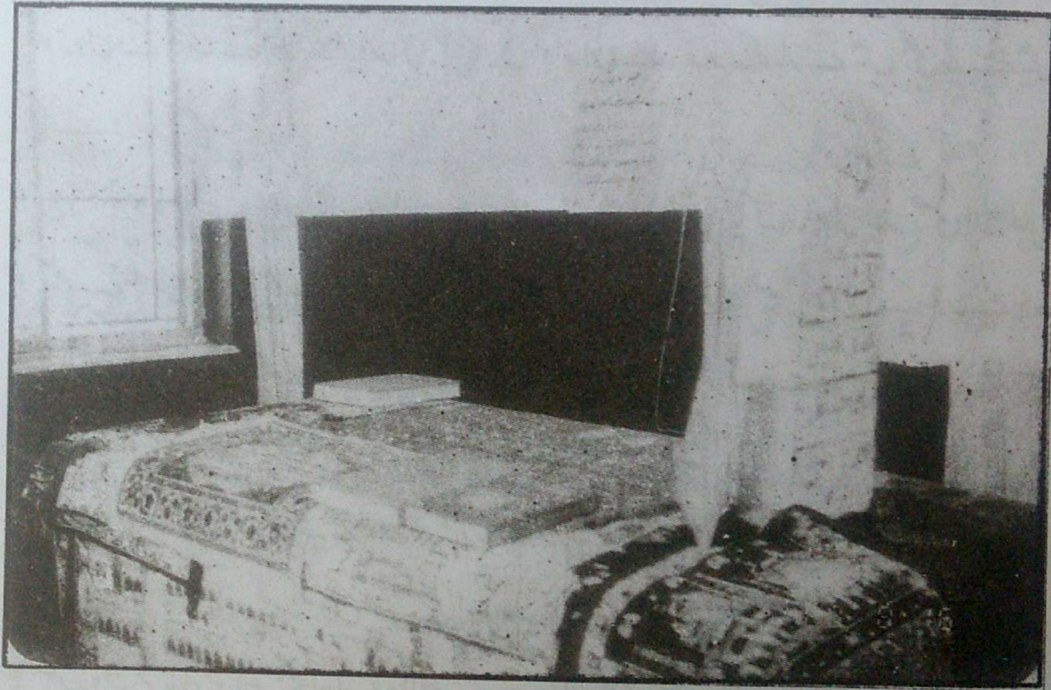


اردن، موتہ، حضرت جعفر طیارؓ، مسجد

اس کے بعد حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے مزارات کی زیارت
کی۔



اردن، مؤتہ، حضرت زید بن حارثہؓ



اردن، مؤتہ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ

وہاں سے واپسی پر ''مشہد'' (یعنی وہ جگہ جہاں غزوۂ مؤتہ ہوا) دیکھا۔ وہاں ایک مینار بھی بنا ہوا ہے۔

ڈرائیور نے بتایا کہ پیر یا جمعرات کی شب میں فجر سے ذرا پہلے بعض لوگوں کو یہاں



اردن، موتہ، "مشہد" یعنی وہ میدان جہاں غزوۂ موتہ ہوا

گھوڑوں کے ہنہنانے اور تلواروں کی جھنکار کی آواز آتی ہے۔ بدر کے بارے میں بھی یہ سننے میں آیا ہے۔ واللہ اعلم۔

غزوۂ موتہ ۸ھ میں ہوا ہے۔ یہ غزوہ اس لیے پیش آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت کے لیے عظیم بُصری کو حارث بن عمیرؓ ازدی کے ذریعے خط ارسال فرمایا تھا۔ شرحبیل بن عمرو غسانی نے، جو قیصر روم کی طرف سے شام کے علاقے بلقاء کا گورنر تھا، حضرت حارث بن عمیر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

سفیر کو قتل کرنا ہمیشہ سے بڑا جرم رہا ہے اور یہ گویا ایک طرح کا اعلانِ جنگ ہوتا ہے کہ جو کرنا ہے کر لو، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومی سلطنت کے خلاف تیس ہزار کا لشکر روانہ فرمایا، جو باہر بھیجا جانے والا سب سے بڑا اسلامی لشکر تھا۔

ہرقل مقابلے کے لیے ایک لاکھ کا لشکر لے کر پہنچا اور اطراف کے قبائل کے ایک لاکھ آدمی مزید جمع ہو گئے۔ اس طرح تیس ہزار آدمیوں کا دو لاکھ سے مقابلہ ہوا۔ اس لشکر کو روانہ کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو اس کا امیر بنایا اور

Scanned by CamScanner

فرمایا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر اور جعفر بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ لشکر کے امیر ہوں گے۔

مقابلہ ہوا تو حضرت زید شہید ہو گئے، جھنڈا حضرت جعفر نے لیا، دایاں بازو کٹا تو جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا، بایاں ہاتھ بھی کٹا تو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے جھنڈے کو تھام لیا۔ اتنے میں یہ جھنڈا حضرت عبداللہ بن رواحہ نے لے لیا اور وہ بھی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

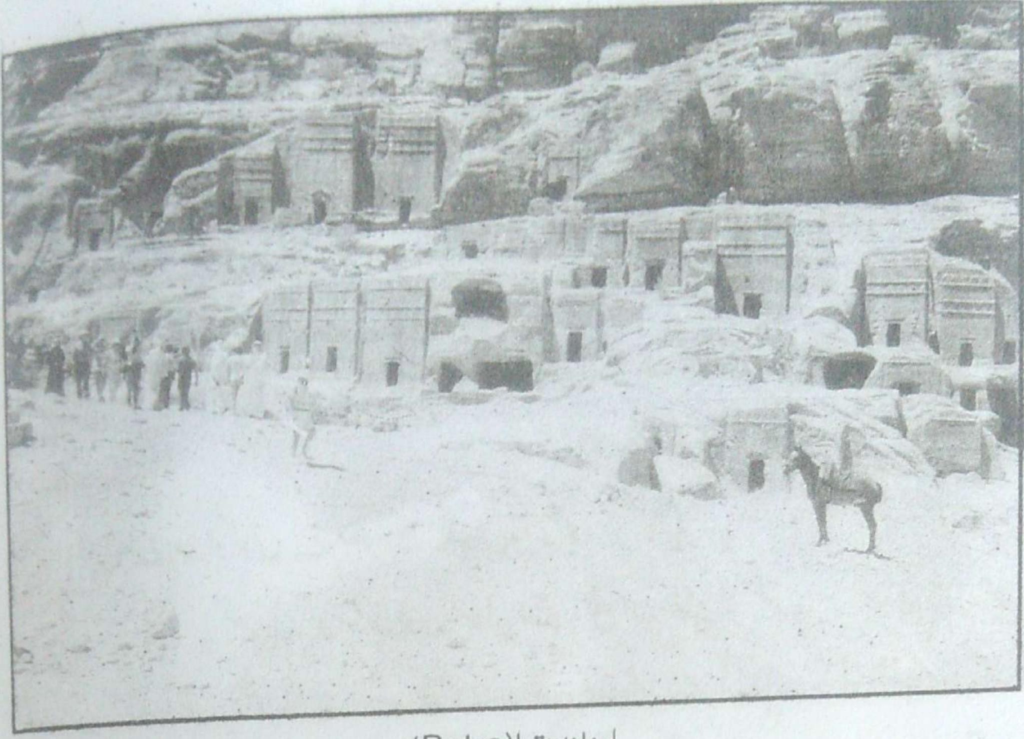
اس کے بعد لوگوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو امیر بنا لیا۔

مؤتہ میں یہ معرکہ گرم تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں بہتے آنسوؤں کے ساتھ یہ خبر دے رہے تھے کہ زید شہید ہو گئے، پھر فرمایا کہ جعفر شہید ہو گئے، پھر فرمایا کہ عبداللہ بن رواحہ بھی شہید ہو گئے اور اب جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار خالد کے پاس ہے۔

حضرت خالد دن کے باقی ماندہ حصے میں جنگ کرتے رہے۔ دوسرے دن حضرت خالد نے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا جس سے دشمن پر یہ ظاہر ہو کہ کل کے مقابلے میں آج لشکر زیادہ ہے، شاید ان کے پاس کمک آگئی ہے۔ صف بندی کے بعد حضرت خالد لشکر کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہے۔ دشمن حیرت میں تھا کہ شاید یہ لوگ کوئی جنگی چال چل رہے ہیں۔ اسی حیرت میں انہوں نے اسلامی لشکر پر حملہ بھی نہ کیا اور حضرت خالد اپنے لشکر کو بحفاظت مدینہ منورہ لے آئے۔

لشکر کو آگے بڑھا کر فتح حاصل کرنے کی طرح بحفاظت لشکر کو واپس لانا بھی ایک فن ہے، ورنہ مسلمان اگر شکست کھا کر بھاگتے تو شاید ایک بھی نہ بچتا، جبکہ اس جنگ میں صرف بارہ صحابہ شہید ہوئے۔

بخاری میں حضرت خالد بن ولیدؓ سے روایت ہے کہ جنگ مؤتہ میں میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں اور آخر میں میرے ہاتھ میں صرف ایک یمنی خنجر رہ گیا تھا۔



اردن، بترا (Petra)

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء

رات ہی کو چھ دینار فی کس کے حساب سے بترا (PETRA) جانے کے لیے بس کے ٹکٹ خرید لیے تھے اور آج صبح بہترین ایئر کنڈیشنڈ بس سے صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب روانہ ہو کر ساڑھے تین گھنٹے میں بترا پہنچے، پھر شام کو سوا تین بجے کے قریب اسی بس سے واپس ہو کر پونے سات بجے عمان پہنچ گئے۔

مشہور ہے کہ عمان آکر جس نے بترا نہ دیکھا اس نے گویا کچھ بھی نہ دیکھا اور یہ صحیح بھی ہے۔ خدائی اور انسانی قدرت کا جیسا حسین امتزاج یہاں نظر آتا ہے شاید مشکل ہی کسی دوسری جگہ نظر آتا ہو۔ مدائن صالح میں بھی یہ بات نہیں، جسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔

آسمان سے باتیں کرتے ہوئے سخت رنگ برنگی چٹانوں کے دو رویہ پہاڑ اور ان کے درمیان میلوں طویل درہ جس کی چوڑائی کہیں صرف اتنی ہے کہ ایک گاڑی گذر سکے اور کہیں زیادہ۔ جہاں نسبتاً چوڑائی ہے وہاں انسانی ہاتھوں کی صناعی نے پہاڑ تراش کر اپنے لیے رہائشی مکانات اور قبریں تیار کیں ہیں۔ اس درے میں داخل ہوں تو پہلے قبریں آتیں ہیں اور ان



اردن، پترا (Petra)

سے بہت آگے چل کر رہائشی مکانات ہیں۔ ہم نصف درے تک بھی نہیں گئے اور جہاں ان کی عدالتیں اور دفاتر بنے ہوئے ہیں وہیں سے لوٹ آئے، حالاں کہ اس سے آگے تقریباً چار کلو میٹر تک ان کے آثار ہیں جن میں ان کا تھیٹر اور معبد قابلِ دید ہیں۔ ہم نے آگے جانے کی ہمت اس لیے نہ کہ کہ اہلیہ کی ہمت نے جواب دے دیا تھا۔ اہلیہ گھوڑے پر سوار تھیں جس کی باگ اس کا مالک پکڑے ہوئے تھا اور میں پیدل چل رہا تھا۔ اہلیہ کے لیے گھوڑے کی سواری ان کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔

۱۸ر اگست ۱۹۸۸ء

ریڈیو سے خبریں سنیں۔ بتایا گیا کہ ضیاء الحق کا طیارہ حادثے کا شکار ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ٥ اس خبر سے پورا دن اداسی میں گذرا۔

نہ صرف عمان بلکہ اردن کے دوسرے بڑے شہروں کو بھی دیکھا کہ عام طور پر عمارتیں سفید (آف وائٹ) پتھروں کی بنی ہوئی ہیں جو یہیں کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ایک پتھر کی قیمت کوالٹی کے لحاظ سے تین سے چھ دینار تک ہے (یہاں کا ایک دینار موجودہ

نرخ کے حساب سے پاکستانی پچاس روپے کے برابر ہے)۔

اردن میں سعودیہ کی طرح تیل کی دولت نہیں لیکن مرسیڈیز اور کیڈیلیک ٹیکسیوں میں چلتی ہیں۔ یہاں گاڑیوں میں میٹروں کی سخت پابندی کی جاتی ہے اور اسی طرح شام میں۔

شام کی طرح اردن میں بھی ہمیں کوئی ہپی نظر نہیں آیا۔ لوگوں کے انگریزی طرز کے بال شرافت کے حدود میں ہوتے ہیں۔

اردن پہاڑی علاقہ ہے اور سرد ہے۔ سردیوں میں عمان تک میں برف باری ہوتی ہے۔

شام اور اردن میں "السلام علیکم" کا رواج نہیں، صرف "العافیة" یا "الله یعطیك العافیة" کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔

اردن میں حضرت یوشع بن نونؑ کا مزار بھی ہے، جس کا ہمیں علم نہ تھا، اس لیے افسوس کہ اس کی زیارت سے محروم رہے۔

استنبول (ترکی)

جدہ میں مصر کا ویزا لے کر میں مصری سفارت خانے سے واپس آرہا تھا کہ راستے میں ایک عمارت پر ترکی جھنڈا دیکھا، خیال ہوا کہ ترکی سفارت خانہ ہوگا۔ گاڑی پارک کی۔ معلوم ہوا کہ واقعۃً ترکی سفارت خانہ ہے۔ بڑا گیٹ بند تھا اور کھڑکی پر لوگوں کا ہجوم۔ میں اس فکر میں کہ اندر داخل ہونے کی کیا صورت ہو دور کھڑا ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک ترک باہر آیا۔ میں نے اسے روک کر دریافت کیا کہ کیا ترکی جانے کے لیے پاکستانیوں کو ویزا کی ضرورت ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات فرسٹ سکریٹری ہی بتا سکتا ہے۔ میں نے کہا: مجھے تو اس کے پاس پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس نے گیٹ کھلوایا اور مجھے لے جا کر فرسٹ سکریٹری کے سامنے کھڑا کر دیا۔ فرسٹ سکریٹری نے بتایا کہ پاکستانیوں کے لیے بھی ویزا ضروری ہے۔ پھر پوچھا: کیا آپ کو ویزا چاہئے ؟ اور کیا آپ کے پاس پاسپورٹ ہے ؟ میں نے اپنا اور بیوی اور بچی کا پاسپورٹ نکال کر دے دیئے۔ اس نے مجھے بٹھایا، پاسپورٹ کارروائی کے لیے اندر بھیجے اور ہمیں آدھے گھنٹے میں ویزا مل گیا۔ میں نے سکریٹری کا شکریہ ادا کیا اور کہا: میرے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ اس طرح اور اتنی جلدی ترکی کا ویزا مل جائے گا۔ اس نے جواب دیا: ہم جب پاکستانی سفارت خانے جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ بھی اسی طرح کا ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔

۹ر جولائی ۱۹۸۵ء

قاہرہ سے استنبول کے لیے روانہ ہوئے۔ پلین پر ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ان

کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا کہ میں پہلی بار استنبول جا رہا ہوں۔ ایئرپورٹ پر اتر کر انھوں نے اپنے میزبان سے، جو مرسیڈیز میں انھیں لینے آئے تھے، کہا کہ ہم کسی ٹیکسی میں چلتے ہیں اور تم اپنے ڈرائیور سے کہو کہ ان لوگوں کو کسی ہوٹل میں ٹھہرا آئے۔ ڈرائیور کو شاید یہ بات ناگوار ہوئی۔ اس نے ہمیں ۲۵ ہزار لیرا یومیہ (تقریباً سات سو پاکستانی) کرائے کے ایک ایسے ہوٹل میں اتارا جس کے اطراف کا پورا... عیاشی کا اڈہ تھا۔

۱۰ر جولائی ۱۹۸۵ء

خیال تھا کہ سب سے پہلے اپنے جد امجد حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی مسجد اور ان کے مزار کی زیارت کریں گے۔ چناں چہ اسی ارادے سے نکلے، لیکن تھوڑی دیر سمندر کے کنارے ٹھیر گئے جو ہوٹل سے تقریباً تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ سامنے بحیرۂ مارمورہ موجیں مار رہا تھا اور دور سے سلطان سلیم کی شاندار مسجد نظر آ رہی تھی۔ یہ خوبصورت منظر پہلی بار دیکھا تھا اس لیے کافی دیر تک اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

اس کے بعد ٹیکسی لی اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار پر پہنچے جسے "ایوب سلطان" کہا جاتا ہے۔ مسجد بھی دیکھی اور مزار بھی۔ مسجد کے مقابلے میں مزار زیادہ خوبصورت تھا۔ نفیس کمرہ، دیواروں پر کندہ آیات، خوبصورت طغرے، بیش قیمت قندیلیں، مزار پر آیات سے مزیّن سبز ریشمی چادر، سرہانے بندھا ہوا عمامہ اور مزار پر بکھرے ہوئے پھول۔ واقعہ یہ ہے کہ ترک بھی قبر پرستی میں مصریوں سے پیچھے نہیں۔

فاتحہ سے فارغ ہو کر ظہر کی نماز ہم نے اسی مسجد میں پڑھی۔ امام صاحب تو سوٹ میں ملبوس، ڈاڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھے، البتہ نمازیوں میں چند عمر رسیدہ آدمی ڈاڑھی والے بھی نظر آئے۔ ایک صاحب جو اگرچہ سوٹ میں تھے لیکن اپنی نسبتاً لمبی ڈاڑھی اور چند معتقدین کی ہمراہی کی وجہ سے صوفی اور پیر معلوم ہوتے تھے، میرے اجنبی لباس اور لمبی ڈاڑھی کو دیکھ کر میری طرف متوجہ ہوئے اور عربی میں گفتگو کی۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے اپنا تعارف کرایا تو بڑی محبت سے پیش آئے اور جیب سے نکال کر عطر گلاب کی ایک شیشی مجھے

عنایت فرب۔

ایوب سلطان میں مزار کو سلامی دینے کے لیے اپنے اعزہ کے ساتھ آئے ہوئے دو نہایت خوبصورت ترک بچے بھی دیکھے جو خاص قسم کا حسین و جمیل لباس پہنے ہوئے تھے۔ بعد میں سلطان احمد کی مسجد میں بھی اس طرح کے بچے دیکھے۔ معلوم ہوا کہ ختنہ کے موقع پر بچوں کو اسی لباس میں پہلے مزارات پر لے جایا جاتا ہے، جن میں سب سے مقدم ایوب سلطان کا مزار ہے، اس کے بعد ختنہ کی جاتی ہے۔

ایوب سلطان سے فارغ ہو کر ہم نے ٹیکسی لی اور مسجد سلطان احمد پہنچے اور مسجد کے ساتھ ساتھ اس کا میوزیم بھی دیکھا۔ اس کے بعد ایا صوفیہ کے میوزیم میں داخل ہوئے۔ پہلے یہ گرجا تھا، بعد میں مسجد بنا دیا گیا اور اب نہ گرجا ہے نہ مسجد بلکہ میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ جابجا حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویریں گرجا ہونے کا پتہ دیتی ہیں اور محراب و منبر مسجد ہونے کا۔ بہر حال اس میوزیم کی عمارت بڑی عالی شان ہے۔ اس میں ایک جگہ دیوار میں ایک سوراخ ہے جسے حضرت خضرؑ کا انگوٹھا کہا جاتا ہے۔ لوگ اس میں اپنا انگوٹھا ڈالتے ہیں۔

ایا صوفیہ سے نکلے تو اس کے قریب ہی ناچ گانے کا پروگرام ہو رہا تھا۔ شام کا وقت تھا، خوبصورت لڑکیاں رقص کر رہی تھیں اور نوجوان مرد بھی۔ لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ گویا مسجد یا میوزیم کے مقابلے میں دیکھنے کی زیادہ اہم چیز یہی ہے۔ مغرب کے بعد ایک لوکاندا میں پہنچے اور سیر ہو کر لذیذ کھانا کھایا۔ استنبول میں لوکاندا کے سوا ہر ہوٹل میں کھانے کے ساتھ شراب ہوتی ہے۔ کھانے سے فراغت کے بعد سوچا کہ چہل قدمی کے لیے ساحلِ سمندر تک چلیں۔ اسی گلی سے گزرے جس میں ہمارا ہوٹل تھا۔ ہم نے دیکھا کہ راستے کے دونوں طرف مکانوں یا ہوٹلوں کے سامنے بنی سنوری جوان جوان عورتیں کھڑی اجنبی مسافروں کو اپنی طرف آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ لمبی سفید ڈاڑھی اور دو عورتوں کی معیت نے مجھے اس دعوت سے محفوظ رکھا۔ میں نے اس پر محمول کیا کہ استنبول میں بے حیائی کی عام کیفیت یہی ہو گی۔

۱۱/ جولائی ۱۹۸۵ء

صبح عابد بشر صاحب کو فون کیا، جو مکہ مکرمہ میں میرے ساتھ کام کرتے ہیں اور تعطیلات میں اپنے وطن استنبول آئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے وہ مل گئے۔ اپنا پتہ بتایا تو فوراً پہنچ گئے اور پہنچتے ہی سب سے پہلی بات جو انہوں نے کہی یہ تھی کہ آپ کس علاقے میں ٹھہر گئے، کوئی شریف آدمی یہاں قیام نہیں کرتا۔ یہ تو ایسا علاقہ ہے جہاں رات کے وقت آتے ہوئے ہمیں بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم تھا۔ عابد بشر صاحب ہمیں لے کر روانہ ہوئے اور راستے میں کہا کہ اقصرائے کے علاقے میں دس ہزار لیرا یومیہ پر بھی کمرہ مل سکتا ہے اور اگر آپ چاہیں تو فاتح میں پندرہ ہزار لیرا یومیہ پر تین کمروں کا پورا فلیٹ بھی مل سکتا ہے، جس میں ضرورت کا ہر سامان ہوگا۔ ہم نے فلیٹ کو ترجیح دی اور باقی ماندہ ایام اسی میں گذارے۔ آج کا باقی ماندہ دن بازار کے گشت اور خرید و فروخت میں گذرا۔

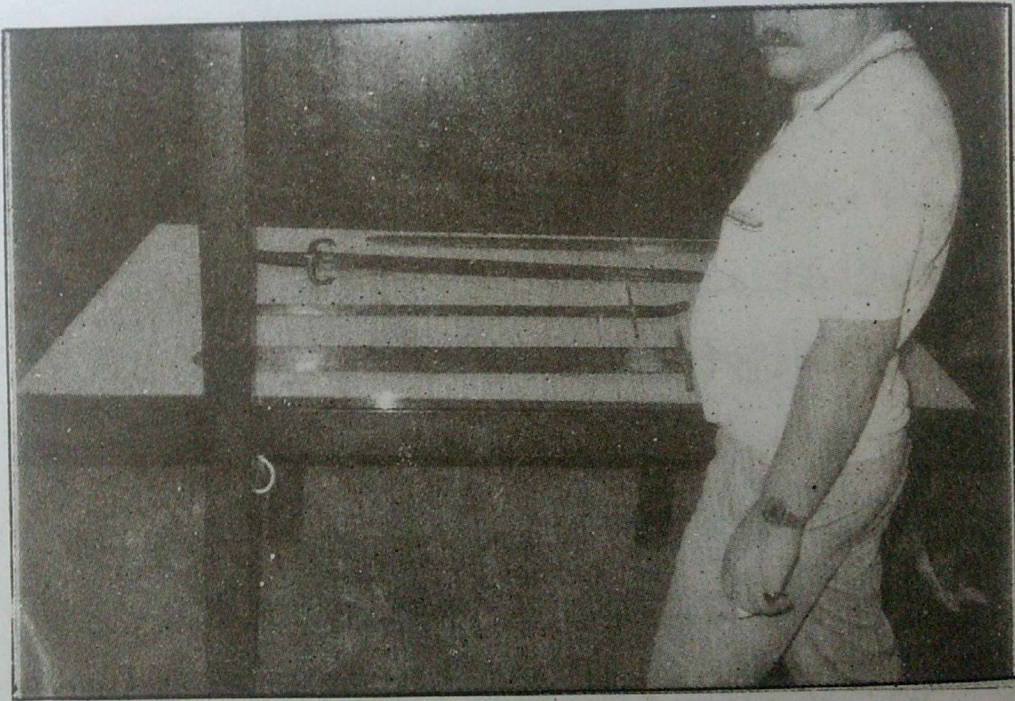
۱۲/ جولائی ۱۹۸۵ء

آج توپ کاپی سرائے دیکھنے گئے، جو پہلے ترک بادشاہوں کی رہائش گاہ تھا۔ خلیفہ عبدالمجید خان نے جب دولمابخشے سرائے بنایا تو بعد کے خلفاء کی رہائش بھی اسی میں رہی اور توپ کاپی سرائے کو میوزیم بنادیا گیا۔ توپ وہی ہے جسے اردو میں توپ کہتے ہیں، کاپی کے معنی ہیں گیٹ یا دروازہ اور سرائے کہتے ہیں محل کو۔

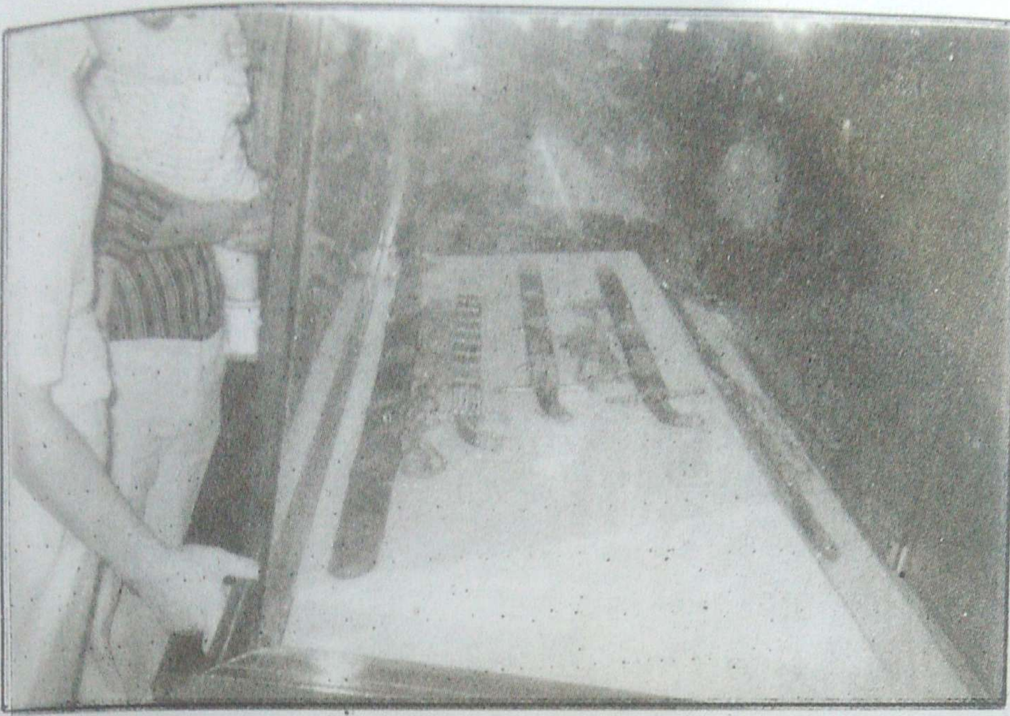
یہ میوزیم نوادر کا عظیم الشان ذخیرہ ہے اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے نوادر کا اس سے زیادہ بیش قیمت ذخیرہ شاید پوری دنیا میں موجود نہ ہو۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو موئے مبارک ہیں، ایک خوبصورت ڈبیہ میں آپ کا وہ دندان مبارک ہے جو غزوۂ احد میں شہید ہوا، قدم مبارک کا عکس بھی ہے اور حضورؐ کی اور صحابہ کی تلواریں بھی ہیں، نیز دوسرے نوادرات بھی۔



استانبول، توپ کاپی، اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو کمانیں اور نیچے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی تلواریں



استانبول، توپ کاپی، بعض صحابہ کی تلواریں



استانبول، توپ کاپی، بعض صحابہ کے خنجر

۱۲/ جولائی ۱۹۸۵ء

آج دولما بخشے سرائے گئے اور سلطان عبد المجید خان کا قصر دیکھا۔ اس قصر کی موجودہ حالت کو دیکھ کر بھی آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ اللہ اللہ ترکی سلاطین کی کیا شان و شوکت تھی۔ پُر شکوہ ہال، جابجا دیواروں اور چھتوں پر سونے کے پانی کا کام، بڑے بڑے فانوس اور قندیلیں، میزیں، کرسیاں، مسہریاں، کھانے کے برتن، تلواریں، خنجر، چھریاں اور لباس اور ان کے علاوہ دوسری بے شمار چیزوں میں سے شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس پر سونے کا کام نہ ہو اور اس میں ہیرے جواہرات نہ جڑے ہوں۔ بعض چیزیں مثلاً چمچ خالص سونے کے جن کے دستوں پر ہیرے جڑے ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس زمانے میں سونا اور جواہرات پانی کے مول ہوں، کم از کم سلاطین کے لیے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ اس قصر میں ۱۸، ٹن سونا استعمال کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ہم نے اس قصر کا صرف مردانہ حصہ دیکھا، زنانہ حصہ بند تھا۔

شام کو کار کے ذریعے باسفورس کا پل عبور کر کے استنبول کے ایشیائی حصے میں پہنچے اور

"شاملے جا" نامی پہاڑی پر چڑھے۔ اس شاداب پہاڑی سے پورے استنبول کا خوبصورت منظر نظر آتا ہے۔ اسے اسلام آباد کی شکر پڑیاں کہنا چاہیے۔

۱۴ر جولائی ۱۹۸۵ء

آج بورصہ کی پہاڑی دیکھنے گئے۔ آمد و رفت کے لیے ۳۵ ہزار لیرا میں ایک کار طے کی۔ صبح ۶ بجے گھر سے روانہ ہوئے۔ استنبول سے کافی دور نکل کر "خرتل" بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہوئے اور کار بھی جہاز پر ہی سوار کی۔ بحیرۂ مار مورہ سے گذرتے ہوئے "یلووا" کی بندرگاہ پر اترے اور وہاں سے کار میں بورصہ کے لیے روانہ ہوئے۔ یلووا سے بورصہ تک سرسبز پہاڑ ہیں اور ہری بھری وادیاں کہ زمین مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ پہاڑوں اور وادیوں پر شفتالو، سرو، زیتون، ناشپاتی، اسٹرابری، چیری، چیکو، انجیر، رس بری، جام اور دوسرے درختوں کے جنگل کے جنگل، کہیں کہیں سورج مکھی کے کھیت، غرض پورا راستہ نہایت خوبصورت تھا۔

بورصہ پہنچ کر یلدرم بایزید کی تعمیر کردہ بیس قبوں والی خوبصورت مسجد "اولو جامع" دیکھی، جس کے اندر خطاطی کے بہترین نمونے تھے۔ بانی سلطنت عثمانیہ "عثمان خان" کی قبر بھی دیکھی جس کے چاروں طرف ان کی اولاد کی قبریں ہیں۔ ان کے بیٹے "اورخان" کی قبر بھی اچھی بنی ہوئی ہے۔

بورصہ کی آبادی سے پہاڑی کے لیے روانہ ہوئے۔ شادابی اور درختوں کی کثرت کی وجہ سے یہ بہت ہی خوبصورت مقام ہے۔ ہماری کار جب بلندی پر جاتے ہوئے بل کھاتی سڑک پر جا رہی تھی تو ایک کے بعد دوسرا انتہائی جاذب نظر منظر سامنے آتا جاتا تھا۔ چوٹی پر پہنچ کر گوشت کا آرڈر دیا۔ ہوٹل والے نے کوئلے کی انگیٹھی، گوشت کے پارچے، دہی، سلاد، نمک اور اجوائن لاکر رکھ دیا۔ ہم پارچے بھون بھون کر کھاتے گئے۔ ہمارے ترک دوست تو مزے لے کر کھاتے گئے لیکن اجوائن نے ہمارا مزہ بگاڑ دیا، کیوں کہ ہم پارچوں میں اجوائن کے بجائے سفید زیرے کے عادی ہیں۔

پہاڑی پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک لفٹ چیئرز چلتی ہیں۔ بیسیوں لفٹس

چل رہی تھیں۔ ایک ایک چیئر پر دو دو سواریاں۔ میں ایک لفٹ میں بیٹھا اور بیوی اور ساجدہ دوسری چیئر میں۔ لفٹ کئی ڈھلانوں اور بلندیوں کو طے کرتی ہوئی، پہاڑی نالوں اور جنگلوں سے گذرتی ہوئی دوسرے کنارے پر پہنچی۔ ہم اسی سے واپس بھی آئے۔ ایوبیہ میں نہ لفٹس کی اتنی تعداد ہے اور نہ اتنا فاصلہ اور نہ لے جانے اور لانے کا اتنا سلیقہ۔

واپسی میں یلووا کے مفتی صاحب کے مکان پر گئے جن سے ہمارے ترک دوست کی ملاقات تھی۔ بہترین سوٹ میں ملبوس ڈاڑھی مونچھوں سے بے نیاز یہ مفتی صاحب ہمارے ساتھ "اسکدر" سے ہوتے ہوئے "ترمل" تک گئے جہاں گرم پانی کے چشمے ہیں۔ ایک جگہ سے اتنی گرم بھاپ نکل رہی تھی کہ منہ اس کے قریب نہ لایا جاتا تھا۔ ترمل کے حسن کو دیکھ کر ہم بورصہ کے حسین قدرتی مناظر کو بھول گئے۔ وجہ یہ تھی کہ بورصہ کی پہاڑی اور اس کے راستوں میں قدرتی حسن تھا اور ترمل میں انسانی ہاتھوں کی مشاطگی نے اس قدرتی حسن کو سلیقے سے سنوار بھی دیا تھا۔ ترمل کے قریب ایک مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی۔ استنبول میں ہمیں جن مساجد میں باجماعت نماز کا موقع ملا، ان میں سے یہی ایک واحد مسجد تھی جس کے جوان امام کے جسم پر اگرچہ سوٹ ہی تھا، لیکن چہرہ ڈاڑھی سے مزیّن تھا۔ حیرت ہوئی کہ انھوں نے یہ جرأت کیسے کی، کیوں کہ ترکی کے تمام امام، قاضی اور مفتی، سرکاری ملازم ہوتے ہیں اور ہر سرکاری ملازم کے لیے ڈاڑھی منڈوانا اور سوٹ پہننا ضروری ہے۔

واپسی میں بحیرہ مارمورہ جہاز ہی پر طے کیا اور رات کے بارہ بجے کے قریب قیام گاہ پر پہنچے۔

۱۷/جولائی ۱۹۸۵ء

آج توپ کاپی سرائے کا میوزیم دوبارہ دیکھا، اس کے بعد دوبارہ ایوب سلطان گئے۔ شام کو عابد صاحب کے ہمراہ اس جگہ گئے جہاں سے سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کے موقع پر گولڈن ہارن کی خلیج میں کشتیاں اتاری تھیں۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر شہر پناہ کے باہر ہے اور اسی کے قریب آبنائے

"گولڈن ہارن" ختم ہو جاتی ہے۔ سلطان محمد فاتح سے پہلے مسلمانوں نے دوبارہ قسطنطنیہ پر حملہ کیا، لیکن ناکام رہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ پہلے حملے میں شہید ہوئے۔

ہم سعودیہ کے پہاڑی اور ریگستانی ملک سے قاہرہ پہنچے تھے۔ قاہرہ میں دریائے نیل کے سوا کوئی خوبصورت قدرتی منظر نہ تھا، ہر طرف آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ استنبول پہنچے تو اس کے قدرتی حسن کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ایشیا اور یورپ ہم آغوش ہوتے ہیں۔ ایک طرف ایشیاء کی شاداب پہاڑیاں ہیں، دوسری طرف یورپ کی، درمیان میں باسفورس کی خلیج۔ استنبول شہر کا ایک حصہ ایشیاء میں ہے دوسرا یورپ میں اور باسفورس کے پل نے دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ قدرتی مناظر اور شادابی



استانبول، باسفورس کا پُل جو ایشیاء اور یورپ کو ملاتا ہے

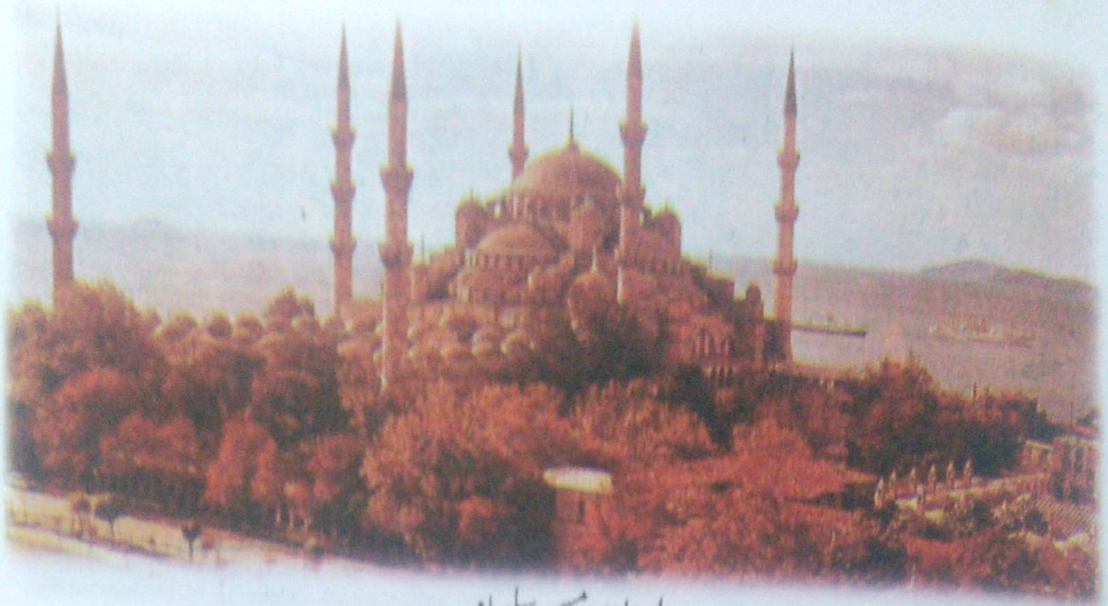
کے اعتبار سے ایشیائی حصہ یورپی حصے سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ایشیاء ہی میں اسکدرا اور ترمل خوبصورت علاقے ہیں۔ یہیں پر "شاملجا" نامی پہاڑی ہے اور ایشیاء ہی میں بورصہ کی پہاڑی ہے، جس کے حسن و جمال کی نظیر مشکل ہے۔ استنبول کا یورپی حصہ البتہ عمارتوں کی شان و شوکت اور صفائی ستھرائی کے لحاظ سے ایشیائی حصے سے بہتر ہے۔ استنبول کی مشہور

مساجد کے فلک بوس میناروں نے یورپی حصے کے عمارتی حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ استنبول کی تمام تر مشہور مساجد، سلاطین اور خلفاء کے قلعے یورپی حصے ہی میں ہیں۔

استنبول کی صاف ستھری عمارتیں، صاف ستھری سڑکیں، صاف ستھری گاڑیاں، صاف ستھرے لباس اور صاف ستھرے گورے گورے انسانوں نے ہمیں بڑا متاثر کیا۔



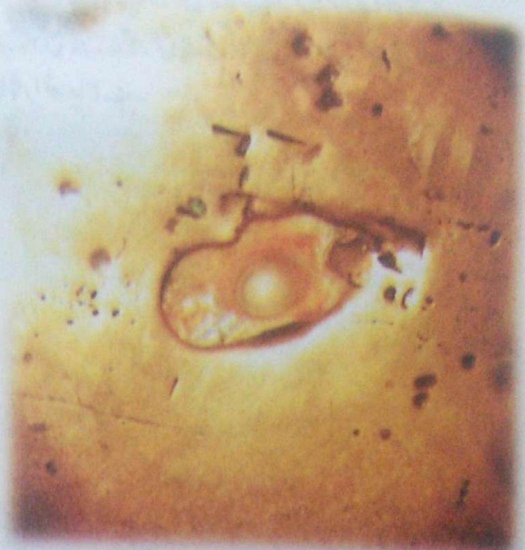
استانبول، وہ تخت جو نادر شاہ دہلی سے لے گیا



اردن، مسجد سلیمانیہ



استانبول، توپ کاپی سرائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک



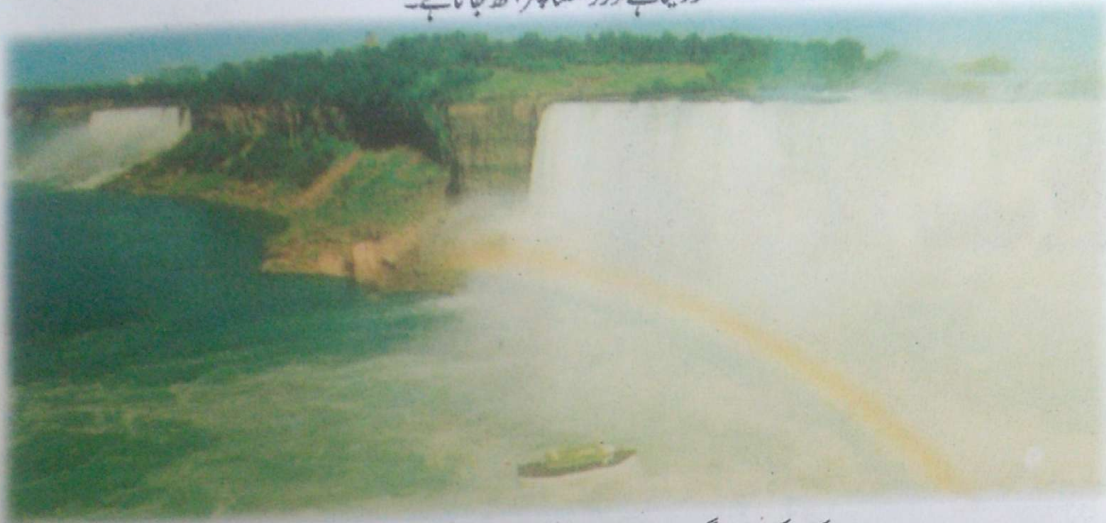
استانبول، توپ کاپی سرائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دندانِ مبارک جو غزوۂ احد میں شہید ہوا



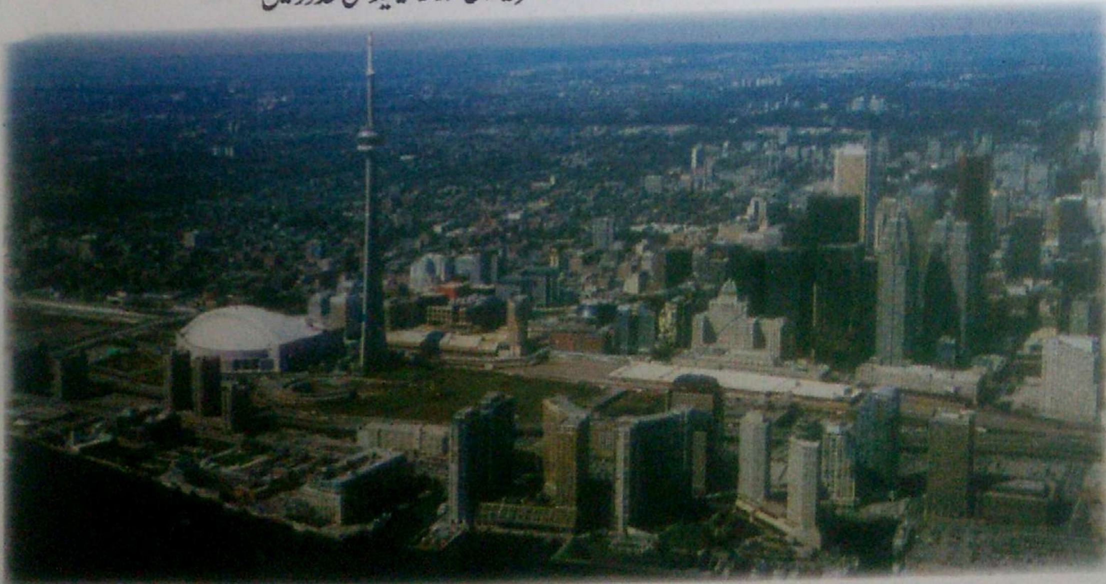
استانبول، توپ کاپی سرائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں قدم مبارک کا نشان



امریکہ، پنسلوانیا، لانگ وڈ گارڈن، پچر پلانٹ، اس پھول کا ڈھکنا اٹھتا رہتا ہے اور اس کے نیچے رس دار زیرہ ہوتا ہے۔ مکھی یا کیڑا زیرے پر آتا ہے تو ڈھکنا فوراً بند ہو جاتا ہے اور یہ پھول کیڑے کا رس چوس کر اس کا مردہ جسم نیچے خارج کر دیتا ہے اور ڈھکنا پھر اٹھ جاتا ہے۔



امریکہ و کینیڈا، نیاگرا فال، چھوٹا حصہ امریکہ کی اور بڑا کینیڈا کی حدود میں



کینیڈا، ٹورنٹو، شہر اور سی۔ این۔ ٹاور، دنیا کی بلند ترین عمارت

امریکہ

یکم جون ۱۹۸۶ء

۲۴ رمضان ۱۴۰۶ھ کو میں اور اہلیہ جدہ سے نیویارک پہنچے۔ سفر کے مصارف (میرے بیٹوں) اظہر اور اختر نے برداشت کیے تھے۔ طیارے کے ذریعے جدہ سے نیویارک کا مسلسل تیرہ گھنٹے کا یہ سفر سخت اکتا دینے والا سفر تھا۔ اکتاہٹ کے اس طویل عرصے میں فرحت کی چند ساعتیں بھی آئیں۔ صبح کے سورج کی نوخیز کرنیں جب سمندر کی کوکھ سے جنم لیتے ہوئے ابر کے برف رنگ پہاڑوں پر پڑیں تو تھوڑی دیر کے لیے ساری کلفت دور ہو گئی۔ اس منظر کے حسن کا صحیح اندازہ پڑھنے یا سننے سے نہیں صرف دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔

جدہ سے سوا بجے روانہ ہوئے تھے اور نیویارک کے ییدن یر پورٹ پر اترتے ہوئے تقریباً پونے سات بج رہے تھے۔ گھڑیوں کے حساب سے یہ سفر تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے میں طے ہوا اور واقعتاً اس میں تقریباً ساڑھے تیرہ گھنٹے صرف ہوئے۔ تثلیث میں توحید کی طرح یہ بھی ایک گورکھ دھندا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تثلیث میں توحید کا معمہ لاینحل ہے اور وقت کا یہ معمہ اس طرح حل ہو جاتا ہے کہ جدہ اور نیویارک کے وقت میں آٹھ گھنٹہ کا فرق ہے کہ روانگی کے وقت اگرچہ جدہ میں مقامی وقت کے مطابق یکم جون تھی اور رات کے سوا کا عمل، لیکن نیویارک کے وقت کے مطابق اس وقت ۳۱ مئی تھی اور دن کے سوا پانچ بجے تھے۔

نیویارک (New York) کے کینیڈی ایئرپورٹ سے نیوارک (New Ork) کے لگاڈیا ایئر پورٹ پر پہنچنا اور وہاں سے ہوسٹن آنا تھا۔ گوروں کے اس ملک میں سب سے پہلے

ایک سنگِ اسود سے پالا پڑا۔ ان صاحب نے ہم سے ہماری منزل پوچھ کر کچھ کہے سنے بغیر ہمارے دونوں سوٹ کیس لیے اور انہیں ان کے پہیوں پر گھسیٹتے ہوئے اپنی پرائیویٹ کار کی طرف چل پڑے۔ میں نے انہیں روک کر کرایہ دریافت کیا۔ فرمایا: دونوں کے ۴۵ ڈالر۔ میں نے کہا کہ لیموزین صرف ۱۵ ڈالر فی نفر لیتی ہے، میں تمہیں دونوں کے ۳۰ ڈالر سے زیادہ نہ دوں گا۔ وہ راضی ہو گئے اور ہم چل پڑے۔ میں نیویارک کے شاداب مناظر میں کھویا ہوا تھا اور نیویارک کے حدود سے نکل کر ہم نیوجرسی کے حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ان صاحب نے گاڑی روک کر ایک کتاب نکالی اور فرمایا کہ اس میں تو نیویارک سے نیوارک تک کا کرایہ فی نفر ۵۵ ڈالر لکھا ہے۔ میں نے کہا ہو گا، ہمارے درمیان تو ۳۰ ڈالر طے ہوئے ہیں۔ بڑی حیل حجت کے بعد فرمایا کہ میں تمہیں یہیں اتارے دیتا ہوں، تم کسی اور گاڑی سے چلے جاؤ۔

میں نے اس نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہ یہاں دوسری ٹیکسی کہاں ملے گی، اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی اور کہا کہ اب تو ہم تمہاری گاڑی میں بیٹھ ہی چکے ہیں، سو ڈالر فی کس بھی طلب کرو گے تو ہم مجبور ہیں۔ دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ منزل پر پہنچ کر کسی پولیس والے کے ذریعے نمٹ لیں گے۔

حُسنِ اتفاق کہ ایئرپورٹ پر پہنچ کر اس نے ٹریفک کی معمولی سی خلاف ورزی کی اور جونہی گاڑی کھڑی کی ایک پولیس سارجنٹ پہنچ گیا۔ میں نے اپنا معاملہ بھی اس کے سامنے پیش کر دیا کہ طے یہ ہوا تھا اور راستے میں اس نے یہ کہا۔ ابھی میں پولیس والے سے پوری بات کہنے بھی نہ پایا تھا کہ کالے نے کہا: جو دینا ہو دو مجھے کیوں لیٹ کر رہے ہو۔ میں تیس ڈالر دے کر اندر آ گیا۔ ممکن ہے سارجنٹ نے اسے تیس ڈالر سے بھی زیادہ کا ٹکٹ دے دیا ہو۔ لالچ اور بدعہدی کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔

ہوسٹن کے ایئرپورٹ پر میرا لڑکا اظہر بقا اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ موجود تھا، ہم اس کی گاڑی پر گھر آ گئے۔

نیویارک، شکاگو اور لاس اینجلس کے بعد ہوسٹن امریکہ کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ یہ شہر، جیسا کہ ایک صاحب نے بتایا، ۱۰۰×۶۰ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ ویسے تو شہر خوبصورت ہے، کچی زمین کہیں نظر نہیں آتی یا تو پختہ حصہ ہے یا سبزہ، لیکن استنبول اور بورصہ کے مناظر تصور میں ہیں، اس لیے ہوسٹن کا جمال کچھ جچا نہیں۔ سنا ہے کہ جنوب کے مقابلے میں شمال زیادہ خوبصورت ہے۔ دیکھیں گے اگر اللہ نے چاہا۔

ہوسٹن پہنچے تو نصرت جہاں (بیوی کی بھتیجی بھی اور ہماری بہو بھی) نے کہا کہ ان دنوں یہاں بہت گرمی پڑ رہی ہے۔ میں نے قصداً دھوپ میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ جو شخص اللہ جل جلالہ کے پُر جلال شہر مکہ سے آیا ہو اسے یہاں کی گرمی کیا محسوس ہو، جیسے مئی کے مقابلے میں مارچ کی دھوپ۔

گاہے گاہے چھائے ہوئے ابر اور گنگناتی بارشوں نے منظر کو زیادہ جمیل اور موسم کو زیادہ لطیف بنا دیا ہے۔

۸/جون ۱۹۸۶ء

آج ہوسٹن میں عید منائی گئی۔ رمضان کے چاند میں امریکہ کے مختلف شہروں اور خود ہوسٹن میں بھی اختلاف تھا، کسی نے جمعہ (۹/مئی) سے روزہ شروع کیا، اس بنیاد پر کہ سعودی عربیہ میں ۹/مئی ہی کو پہلا روزہ تھا اور کسی نے ہفتے سے شروع کیا، اس لیے کہ ہوسٹن میں چاند نظر نہ آیا تھا۔ جن لوگوں نے جمعہ سے روزہ شروع کیا تھا ان کے تو تیس روزے پورے ہو گئے لیکن جن لوگوں نے ہفتے سے روزے شروع کئے تھے ان کے اگرچہ ۲۹ روزے ہوئے تھے پھر بھی انہوں نے سب کے ساتھ آج ہی عید منائی، اس لیے کہ اسلامک سینٹر نے آج ہی کے دن عید کا اعلان کیا تھا۔ چاند کے مسئلے نے دنیا میں ہر جگہ اختلاف پیدا کر رکھا ہے۔ جب مطالع مختلف ہیں اور ایک ہی وقت میں کہیں دن ہے کہیں رات تو دنیا میں ایک ہی روز عید منانے پر کیوں اصرار کیا جائے۔

عید کی نماز البرٹ تھامس کنونشن اینڈ ایگزیبٹ سینٹر (Albert Thomas

(Convention and Exhibit Center میں ہوئی۔ یہ سینٹر ڈاؤن ٹاؤن میں ہے۔
ایک روز کے لیے یہ ہال چار ہزار ڈالر کرایہ پر لیا گیا تھا۔ چوں کہ اتوار کا دن تھا، اس لیے مجمع کافی تھا۔ عورتیں اور مرد ملا کر تقریباً آٹھ دس ہزار کا مجمع تھا۔ اسلامک سینٹر کے صدر مسٹر جمعہ نے نماز پڑھائی۔ ٹائی کے ساتھ سوٹ پہنے تھے۔ خطبہ انگریزی میں تھا۔

۲۰ جون ۱۹۸۶ء

آج جمعہ کی نماز ہوسٹن کے اسلامک سینٹر کی مسجد میں پڑھی۔ اسلامک سینٹر ڈاؤن ٹاؤن کے قریب ہے۔ امریکہ کے ہر شہر کی طرح یہاں کا ڈاؤن ٹاؤن بھی تجارت کا مرکز ہے۔ بڑے بڑے دفاتر اور عالی شان عمارتیں ہیں۔ وہاں رہائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ شام کے چھ بجے جب دوکانیں اور دفاتر بند ہو جاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ اس علاقے میں کالوں اور آوارہ عورتوں کا راج ہوتا ہے۔ اس وقت شریف آدمی یہاں سے گذرتے ہوئے بھی ڈرتا ہے اور مجبوراً گذرتا بھی ہے تو شیشے چڑھا کر کہ سرخ سگنل پر اگر گاڑی رکے تو کوئی کالا پستول دکھا کر سب کچھ دینے پر مجبور نہ کر دے۔

امریکہ کا علاقہ مشرق سے مغرب تک ۴۵۰۰ کلو میٹر اور شمال سے جنوب تک ۲۵۰۰ کلو میٹر میں پھیلا ہوا ہے۔ سب سے بڑا شہر نیویارک ہے، دوسرا شکاگو، تیسرا لاس اینجلس اور چوتھا ہوسٹن۔ میرے لڑکے اظہر بقا کا قیام چوں کہ ہوسٹن میں ہے اس لیے میرا قیام بھی زیادہ تر وہیں رہا۔ ہوسٹن کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں؛ ایک ناسا (NASA) جو اسپیس پروگرام کا مرکز ہے دوسرا میڈیکل سینٹر جو امریکہ کا اور اس کی مناسبت سے دنیا کا سب سے اچھا میڈیکل سینٹر ہے۔

ہوسٹن کے قیام کے دوران اندازہ ہوا کہ غالباً امریکہ میں اظہر کا قیام طویل ہوگا اور اس کا لڑکا شاذان یہیں کے دنیادار، دین بیزار اور حیا سوز ماحول میں پروان چڑھے گا۔ میں نے ایک روز اظہر کو نصیحت کرتے ہوئے حسبِ ذیل قصہ سنایا:

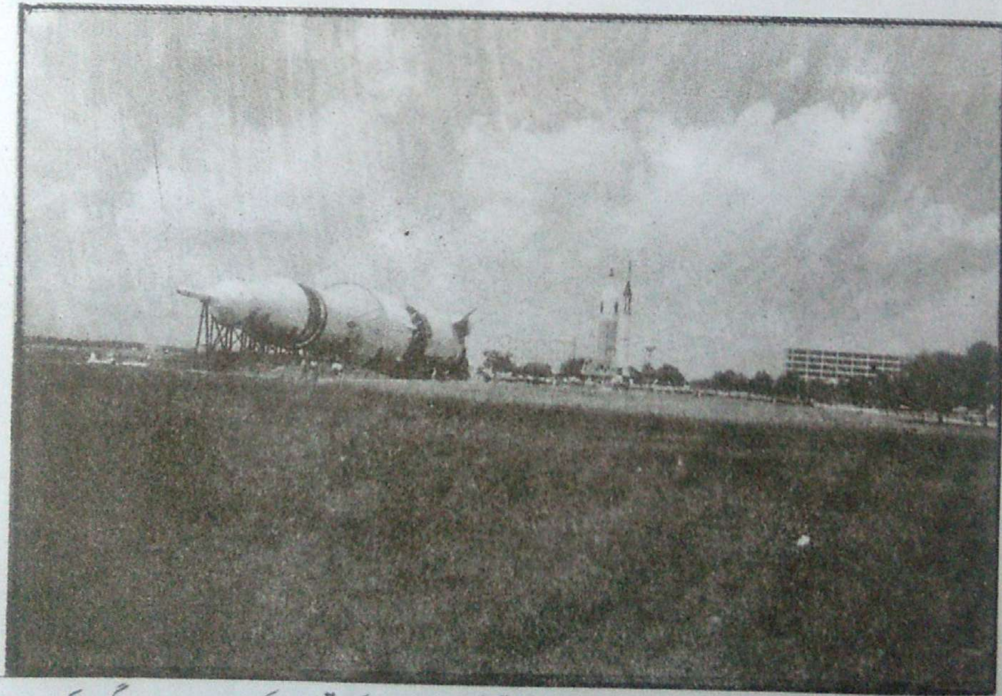
دو کمیونسٹ دوست تھے، ایک سکھ دوسرا مسلمان۔ ایک روز مسلمان دوست اپنے

لڑکے کو قرآن کریم پڑھا رہا تھا کہ سکھ دوست آگیا۔ تعجب سے پوچھا: تم اور مذہبی کتاب کی تعلیم؟ مسلمان نے جواب دیا: میں نے اپنے والدین سے جو وراثت پائی تھی اسے اولاد تک منتقل کر رہا ہوں۔ اس کے بعد جس طرح ذاتی غور و فکر کے نتیجے پر میں کمیونسٹ بنا ہوں، چاہے تو یہ بھی بن جائے۔

۲۴ر جون ۱۹۸۶ء، بروز اتوار

آج جانسن اسپیس سینٹر دیکھنے گئے جو ناسا کے نام سے مشہور ہے (National Aeronautics & Space Administration)۔ ایک وسیع اور خوبصورت سبزہ زار میں مختلف عمارتیں بنی ہیں، جن پر فضا کے سلسلے میں مختلف مراحل کی تفصیلات ہیں۔

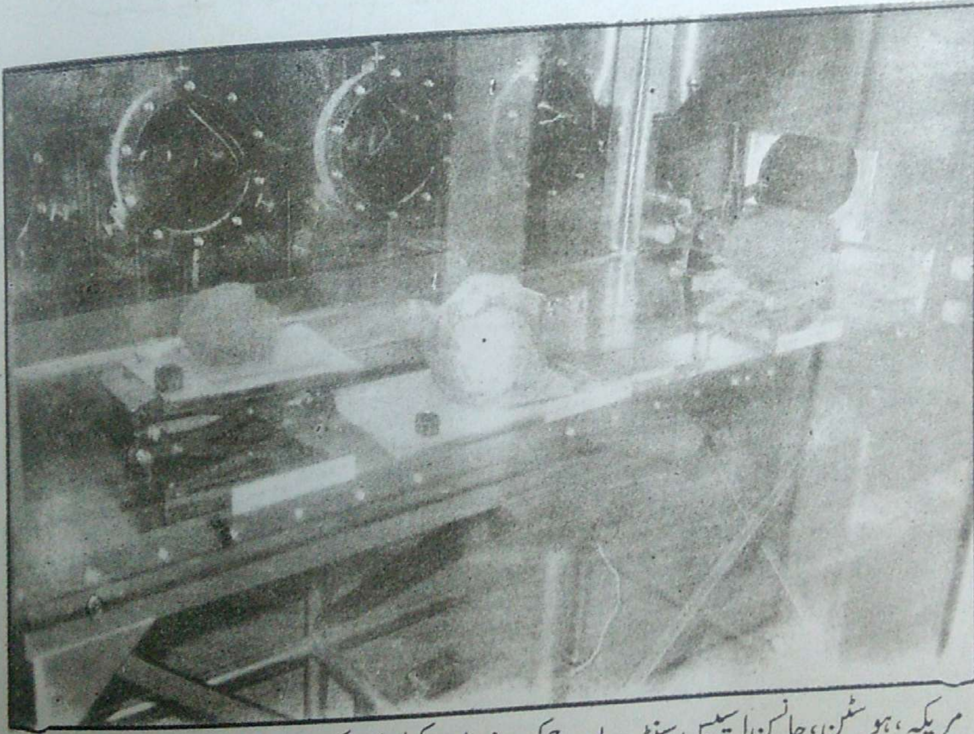
سب سے پہلے اپولو۔ ۲ پر پہنچے۔ یہ دیو ہیکل راکٹ فضا کے لاکھوں میل کے سفر سے چور ہو کر زمین پر بے سدھ پڑا اپنی تکان دور کر رہا ہے۔ اس کے قریب ہی دو چھوٹے راکٹ کھڑے ہیں گویا پہرہ دار ہوں کہ اس کے آرام میں خلل نہ آنے پائے۔ میں نے اس کی دائمی نیند کے اس منظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا۔



امریکہ، ہوسٹن، جانسن اسپیس سینٹر، 'اپولو ۲' کا فوٹو آگے سے اور اسکے قریب کھڑے ہوئے دیگر راکٹ

اس کے بعد مختلف عمارتوں میں داخل ہوئے۔ فضا پیماؤں کے کھانے، ان کے باتھ رومز، سونے کے کمرے، استعمال کی چیزیں مثلاً ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، لباس، راکٹوں کی بیرونی حالت اور اندرونی مشینری، چاند کے پتھر، غرض ایک ایک چیز اصلی حالت میں دیکھی۔ نہ کوئی چیز راز تھی اور نہ کسی چیز کا فوٹو لینے کی ممانعت۔ جگہ جگہ ٹی وی سیٹ لگے ہوئے تھے۔ بٹن دبایئے اور اس عمارت میں موجود تفصیلات کی فلم دیکھ لیجئے۔ البتہ تعجب اس پر ہوا کہ سرزمین تو تھی امریکہ کی اور ٹی وی سیٹ تھے جاپان کے سونی (SONY)۔

ایک کمرے میں چاند کے کچھ پتھر رکھے ہوئے ہیں اور پتھروں پر تحقیق کے لیے سائنسدان خاص لباس پہن کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ اس کمرے میں چاند ہی کا درجۂ حرارت رکھا جاتا ہے۔



مریکہ، ہوسٹن، جانسن اسپیس سینٹر، ریسرچ کرنے والوں کیلئے ایک کمرے میں رکھے ہوئے چاند کے پتھر

اس سینٹر میں فضا پیماؤں کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ راکٹ اگرچہ کیپ کینیڈی سے چھوڑے جاتے ہیں، لیکن انہیں کنٹرول یہیں سے کیا جاتا ہے۔



امریکہ، ہوسٹن، جانسن اسپیس سینٹر، چاند پر ایک پتھر کے قریب کھڑا ہوا فضا پیما

۲۶؍جون ۱۹۸۶ء

سوا سات بجے شام کو (یہاں تقریباً ساڑھے آٹھ بجے آفتاب غروب ہوتا ہے) ہوسٹن سے مع اہلیہ کے میامی روانہ ہوا۔ پونے دو گھنٹہ کے بعد جہاز کے دونوں طرف سے نظر آنے والی حد نظر تک پھیلی ہوئی زرد، سبز اور سرخ روشنیوں نے تقریباً پچاس لاکھ کی آبادی کے میامی شہر کی آمد کی نوید سنائی۔ ٹھیک دو گھنٹے میں پین۔ ایم نے ایئر پورٹ پر اتار دیا۔ میں نے مقامی وقت کے مطابق گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کر لیا۔ افروز کے مکان پر قیام کرنا تھا کہ ایئر پورٹ پہنچ کر فون کر دوں گا، چناں چہ فون کیا۔ ان کے دوست نے بتایا کہ وہ ایئر پورٹ روانہ ہو چکے ہیں۔ کافی انتظار کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ فون کیا۔ فون کسی نے نہ اٹھایا۔ یقین ہوا کہ ہماری تلاش میں ایئر پورٹ ہی پر سرگرداں ہوں گے۔ جب دو گھنٹے گذر گئے تو ایک امریکن بڑے میاں کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا: وہ سفید ٹیلیفون اٹھاؤ اور آپریٹر سے اس اعلان کے لیے کہو کہ میں اس جگہ پر مسٹر افروز کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپریٹر نے اعلان کر دیا، جسے ہم نے بھی سنا۔ پندرہ منٹ گذرنے پر چوتھی بار پھر مکان پر فون کیا۔ بولے کہ

ایئر پورٹ کے اوپر اور نیچے چھ چکر لگا کر ابھی گھر لوٹا ہوں اس خیال سے کہ آپ یقیناً گھر پر فون کریں گے۔ چناں چہ ملنے کی جگہ طے کی اور وہ دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔

میامی میں افروز کے پاس قیام کیا۔ کھانے کے بعد تقریباً ڈھائی بجے سونا نصیب ہوا۔ الارم نے صبح پونے چھ بجے جگایا۔ نماز کے بعد پھر سونا چاہا کہ نیند پوری ہو، لیکن سینے کے ہلکے ہلکے ریاحی درد نے، جو کبھی کبھی ہو جاتا ہے، سونے نہ دیا۔ سوچا کہ صبح کا منظر ہی دیکھوں۔ کھڑکی کھولی تو زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ سامنے سرسبز لان اور موسلادھار بارش، سونے میں کھونے کے بجائے دیر تک اس منظر میں کھویا رہا۔

۲۷ر جون ۱۹۸۶ء

سارا دن میامی میں گذارا اور جمعہ کی نماز کے بعد افروز کی گاڑی میں میامی شہر کی تفریح کی۔ ڈیڈ (Dade) کمیونٹی کالج دیکھا، ایف۔ آئی۔ اے یونیورسٹی کے پاس سے گذرے۔ میامی لیک (Lake) کے خوبصورت علاقے میں گھومے۔ یہ پورا علاقہ فلوریڈا کے گورنر "باب" (Bob) کی ملکیت ہے۔ اسلامک سینٹر کے لیے جو چار ایکڑ زمین خریدی گئی ہے وہ بھی دیکھی، فی الحال صرف ایک کمرہ ہے۔ اس کی قیمت کسی اسپینش مسلمان نے ادا کی ہے۔

خاص طور پر میامی کی دو چیزیں سیاحوں کو کھینچ کر لاتی ہیں۔ ایک وہ کلب جن میں عریانی رقص کرتی ہے، دوسرے بیچز۔ کسی کلب میں جانے کی جرأت تو نہ ہوئی البتہ بیچ پر ضرور گئے۔

وہی مشہور میامی بیچ جس کے نظارے دیکھنے اور دادِ عیش دینے کے لیے دنیا کے زندہ دل سیاح کھنچے آتے ہیں۔ سمندر اور ان کے ساحل تو اور جگہ بھی ہیں لیکن یہ نظارے ہر جگہ میسر نہیں۔ ستر غلیظ اور مقاماتِ زینت کو چھپانے کے لیے کپڑے کے استعمال میں عورتیں ضرورت سے زیادہ کفایت شعار نظر آئیں۔ پانچ منٹ ہی ٹھہرے ہوں گے کہ عریاں نظاروں کی تاب نہ لا کر واپس ہو گئے۔ ابھی نووارد ہیں، چند روز اور ٹھہریں تو کچھ بعید نہیں کہ ہماری نظروں سے بھی حیا کا نقاب اٹھ جائے۔

میامی سے بُش گارڈنز(Busch Gardens)

۲۸ر جون ۱۹۸۶ء

آرزو تھی کہ امریکہ کے کچھ علاقے میں بس کا سفر کیا جائے تاکہ آبادی کے مصنوعی مناظر سے نکل کر قدرتی مناظر سے بھی لطف اندوز ہو سکیں۔ اللہ نے یہ آرزو بھی پوری کر دی کہ میامی، ٹیمپا، آرلینڈو، ملبورن، کیپ کینیڈی تک کا تقریباً آٹھ سو میل کا سفر افروز کی گاڑی (Celebrity) پر کیا۔

تقریباً چار بجے صبح میامی سے ٹیمپا(Tempa) روانہ ہوئے جہاں بُش گارڈن دیکھنا تھا۔ جوں جوں نور پھیلتا گیا مناظر کا حسن مسحور سے مسحور تر کرتا گیا۔ ہائی وے (یا فری وے) کے دونوں جانب چار پانچ گز کی سبزے کی پٹی جس کے قدرتی حسن کو انسانی ہاتھ سنوارتے رہتے ہیں، اس پٹی کے پیچھے قدرتی مناظر، حدِ نظر تک پھیلا ہوا سبزہ، کہیں دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیاں، کہیں اونچے اونچے درخت، کہیں گھنے جنگل، بارش کا موسم، ہر جگہ پانی کی افراط اور اس کے نتیجے میں سیاہی کی حدود کو چھوتی ہوئی ہریالی اور کہیں چھایا ہوا گہرا کہر۔

ہائی ویز پر جگہ جگہ باتھ رومز بنے ہوئے ہیں، جنہیں امریکہ میں ریسٹ رومز کہا جاتا ہے۔ انتہائی صاف ستھرے اور ہر جگہ کاغذ اور پانی کا اہتمام۔ انہیں دیکھ کر مجھے سعودیہ کے باتھ رومز یاد آگئے کہ کبھی کبھی ان میں داخل ہوتے ہی دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ حکومت نے تو انہیں صاف ستھرا بنایا ہے، لیکن جب پبلک کو استعمال کا سلیقہ ہی نہ ہو تو حکومت کیا کرے۔

ٹیمپا پہنچنے پر بُش گارڈن جانے کے لیے یونیورسٹی آف ساؤتھ فلوریڈا کے سامنے سے گذرے۔ بہت بڑے سر سبز خوبصورت ایریا میں واقع عمارتیں دور سے دیکھیں۔

بُش گارڈن پہنچے اور تقریباً آٹھ گھنٹے اس کی تفریح میں صرف کئے۔ سولہ ڈالر فی کس ٹکٹ تھا۔ سب سے پہلے جو منظر سامنے آیا وہ ڈائس پر رقص کرتی ہوئی دو جوان لڑکیاں تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سیمیں تن پریاں نورانی لباس پہن کر زمین پر اتر آئی ہیں۔ نیم عریاں

سینے ، ناف سے کافی نیچے بندھے ہوئے جسم کے ہم رنگ لمبے لمبے سفید اسکرٹ اور مچھلی جیسی لچکتی کمر۔

اس طرح کا منظر نوجوانوں کے لیے یقیناً ہیجان انگیز ہو گا (بشرطیکہ امریکہ آئے انھیں زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو) لیکن میری نظریں بار بار جھک جاتی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ پہلی غیر اختیاری نظر کے بعد میری دوسری اختیاری نظر ایسے منظر کی طرف اٹھی ہی کیوں ؟ دراصل یہ اثر ہے ان مناظر کا جو ۲۷ دن سے امریکہ کی سڑکوں پر دیکھ رہا ہوں۔ گھر سے باہر قدم نکالئے تو نا ممکن ہے کہ قدم قدم پر نیم عریاں سینوں اور رانوں کے آخری جوڑ تک کھلی ہوئی ٹانگوں پر نظر نہ پڑے۔ ابھی تو مجھے یہاں پونے دو ماہ مزید رہنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جانوروں کی طرح حیا کے احساس سے عاری ہو کر اپنی غیرت کو امریکہ کی سرزمین ہی میں دفن کر جاؤں۔

بُش گارڈن میں تربیت یافتہ طوطوں کا شو بھی دیکھا اور ایک سرکس کا شو بھی۔ سرکس شو میں ایک جاپانی فنکار کا یہ مظاہرہ حیرت انگیز اور قابلِ داد تھا کہ اس نے تقریباً ایک بالشت قطر کی پھرکنی کو ڈائس پر پھرا کر ہتھیلی پر لیا، ہتھیلی سے انگلی پر اور انگلی سے اس تلوار کی دھار پر جو بائیں ہاتھ میں تھی اور انتہائی احتیاط کے ساتھ اسے دھار پر آگے پیچھے گھماتا رہا۔

بُش گارڈن میں ٹرین کا سفر بھی کیا، لفٹ چیئر پر بھی بیٹھے اور معلق ٹرین (Mono Train) میں بھی۔ معلق ٹرین جانوروں کے علاقوں پر سے گذر رہی تھی۔ ببر شیر، مختلف قسم کے ہرن، آبی پرندے، سمندری گھوڑے، گینڈے، زیبرا، شتر مرغ، زراف اور دوسرے جانور دیکھے اس طرح گویا سفاری پارک میں گھوم رہے ہوں۔ سب سے زیادہ لطف کشتی کی سیر میں آیا کہ دو جگہ یہ کشتیاں بلندی پر پہنچ کر ہولناک طریقے سے نیچے اترتی بلکہ گرتی ہیں۔ کمزور دلوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ میری بیوی جنھوں نے دوسروں کے سامنے کبھی میرا ہاتھ بھی نہیں پکڑا، پوری طاقت سے میری کمر پکڑے تھیں اور سب دیکھ رہے تھے۔

اس تفریح سے فارغ ہو کر ملبورن کے لیے روانہ ہوئے۔

ملبورن تقریباً پچاس ہزار کی آبادی کا ایک قصبہ ہے اور .F.I.T یونیورسٹی اور ہیرس کمپنی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یونیورسٹی میں تقریباً دس ہزار طلبہ ہیں جن کی اکثریت بیرونی ممالک سے تعلق رکھتی ہے۔ فیسیں بہت زیادہ ہیں۔ ہیرس کمپنی کمپیوٹر بھی بناتی ہے اور اسے اسپیس سینٹر کے پروجیکٹس بھی ملتے رہتے ہیں۔ ملبورن میں اس کے پندرہ ہزار ملازم ہیں اور ملبورن سے باہر تقریباً بیس ہزار۔

کینیڈی اسپیس سینٹر

۲۹ / جون ۱۹۸۶ء

ملبورن سے تقریباً گیارہ بجے کینیڈی اسپیس سینٹر روانہ ہوئے جو ملبورن سے تقریباً ۳۵ میل دور ہے۔ میلوں تک پھیلے ہوئے اس سرسبز خطے میں داخل ہوئے۔ اتوار کا دن تھا اور زائرین کا ہجوم۔ مختلف ٹکٹوں کی فی کس مجموعی قیمت تقریباً ساڑھے چار ڈالر تھی۔ سب سے پہلے جانسن اسپیس سینٹر جیسا منظر سامنے آیا کہ ایک راکٹ لیٹا ہے اور سات راکٹ کھڑے پہرہ دے رہے ہیں۔ بارہ پینیتیس پر مختلف مقامات کی سیر کے لیے بس میں روانہ ہوئے۔ بس جس علاقے سے بھی گذری اتنا خوبصورت تھا کہ لفظ و بیان اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ ایک کمرے میں چاند ہی کی زمین بنا کر اس میں چاند گاڑی اتری ہوئی بتائی تھی اور دو فضا پیما کھڑے تھے زمین پر سیاہی مائل بھورے رنگ کے کنکر اور چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ پھر دوسرے کمرے میں داخل ہوئے جس میں کمپیوٹر اور ٹی وی سیٹ وغیرہ نصب تھے۔ چوں کہ اتوار کا دن تھا اس لیے کام کرنے والا کوئی نہ تھا۔ تاریکی کر کے راکٹ چھوڑنے اور زمین پر اترنے کی فلم بتائی گئی۔ راکٹ چھوڑا گیا تو قابلِ برداشت مصنوعی گرج پیدا کی گئی۔ گذرتے ہوئے وہ عمارت بھی دیکھی جس میں راکٹ تیار کیا جاتا ہے اور وہ سڑک بھی جس پر سے راکٹ، لانچنگ پیڈ پر لایا جاتا ہے، شاید سوفٹ چوڑی ہوگی۔ بیچ میں سبزہ کی چوڑی پٹی اور دونوں طرف کنکر، کیوں کہ راکٹ جس گاڑی پر لے جایا جاتا ہے



امریکہ، فلوریڈا، کینیڈی اسپیس سینٹر، وہ عمارت جس میں راکٹ بنائے جاتے ہیں

اس میں ٹینک کی طرح چین ہوتی ہے۔ میں نے بس میں سے ایک لانچنگ پیڈ کا فوٹو لیا۔ ۲۸/جنوری کو چھوڑا گیا جو راکٹ تباہ ہوا وہ اسی پیڈ سے چھوڑا گیا تھا۔ اس کے سامنے اٹلانٹک موجیں مار رہا ہے۔ اس سے فاصلے پر ایک اور لانچنگ پیڈ ہے۔ ہمیں ایسے مقام پر



امریکہ، کیپ کینیڈی، یہ نچنگ پیڈ جس سے راکٹ چھ باتا ۔

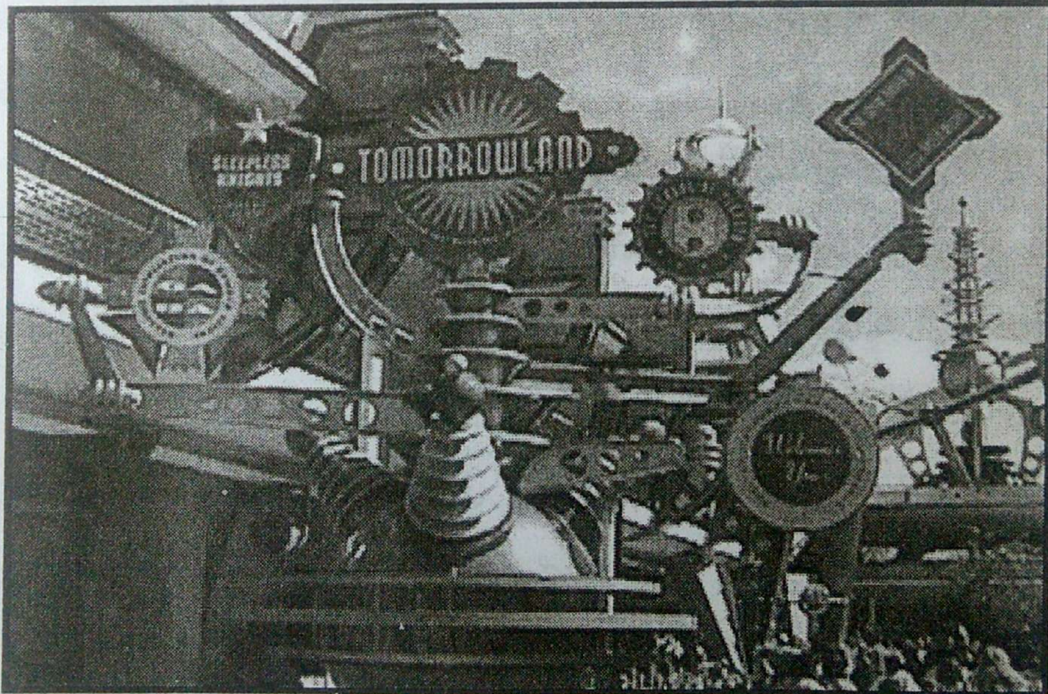
اتار اگیا جہاں سے ایک پیڈ کا فاصلہ تقریباً تین اور دوسرے کا تقریباً دو میل ہو گا۔ کسی پیڈ پر نہیں گئے۔

سوا تین بجے ایک تھیٹر میں داخل ہوئے۔ پانچ منزلہ چوکور اسکرین پر راکٹ چھوڑنے کا منظر اور راکٹ کے اندر فضا پیماؤں کے اعمال دکھائے گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہم اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ آگے جا رہا ہے تو گویا ہم بھی آگے اور اوپر تو ہم بھی اوپر۔ فلم تین پچاس پر ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہماری یہ تفریح بھی ختم ہو گئی۔

سوا چار بجے کینیڈی اسپیس سینٹر سے آرلینڈو کے لیے روانہ ہوئے۔ شام کا وقت تھا کہ ہم ڈزنی ورلڈ کے خوبصورت علاقے میں داخل ہوئے۔ یہ علاقہ اتنا حسین ہے کہ کینیڈی اسپیس سینٹر کے حسن کو بھول گئے۔

ڈزنی ورلڈ، آرلینڈو

میجک کنگڈم اور ایپکاٹ سینٹر



ڈزنی ورلڈ، آرلینڈو

Scanned by CamScanner

والٹ ڈزنی (Walt Disney) دراصل ایک فلمساز تھا۔ اس نے پہلے کیلی فورنیا میں ڈزنی لینڈ بنایا اور ۱۷ جولائی ۱۹۵۵ء کو اس کا افتتاح کیا۔ پھر اس نے فلوریڈا میں ۲۷۵۰۰ ایکڑ کے رقبے میں ڈزنی ورلڈ بنایا۔ اس نے اس سلسلے میں صرف اپنے تصورات اور منصوبے پیش کیے تھے کہ ۱۹۶۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ سنا ہے کہ اس کی لاش کو منجمد کر دیا گیا ہے کیوں کہ اس کی یہی وصیت تھی اور یہ وصیت اس نے یہ کہہ کر کی تھی کہ ہو سکتا ہے مستقبل میں سائنس اتنی ترقی کر لے کہ انسان منجمد لاش کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہو جائے۔ والٹ ڈزنی نے جو انتظامیہ قائم کی تھی اس نے ڈزنی کے بھائی رائے (Roy) کی سربراہی میں ڈزنی ورلڈ کے منصوبے کی تکمیل کی اور یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء کو اس کا افتتاح ہوا۔ ڈزنی ورلڈ کا ایک حصہ میجک کنگڈم (Magic Kingdom) کہلاتا ہے۔ دوسرا ایپکاٹ سینٹر (Epcot Center)۔

والٹ ڈزنی نے ۱۹۶۴ء میں ایپکاٹ سینٹر کا منصوبہ بنایا، لیکن چوں کہ ۱۹۶۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا اس لیے اس کی زندگی میں اس منصوبے کی بھی تکمیل نہ ہو سکی۔ ڈزنی انتظامیہ نے انہی خطوط پر اس کی تکمیل کی۔ اس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ ماضی کیا تھا، حال کیا ہے اور مستقبل کیا ہو گا۔

میجک کنگڈم اور ایپکاٹ سینٹر دونوں میں داخلے کا علحدہ علحدہ ٹکٹ فی کس ۲۵،۲۵ ڈالر ہے۔ ہم آرلینڈو ایسے وقت پہنچے کہ میجک کنگڈم دیکھنے کے لیے ہمارے پاس صرف تقریباً سات گھنٹے تھے۔ دوسرا دن ہم نے پورا کا پورا ایپکاٹ سینٹر دیکھنے میں صرف کیا اور نو گھنٹے تک مسلسل اس کی سیر کرتے رہے۔ سوچا کہ کیلیفورنیا جائیں گے تو ڈزنی لینڈ دیکھ لیں گے جس سے میجک کنگڈم کے بیشتر حصے نہ دیکھنے کی کسی حد تک تلافی ہو جائے گی، لیکن کیلیفورنیا میں ایپکاٹ سینٹر نہیں ہے اس لیے اس پر زیادہ وقت صرف کیا۔

ان دونوں مقامات پر میں نے جو کچھ دیکھا، اشاریاتی انداز میں ایک کاغذ پر لکھتا گیا تھا۔ افسوس کہ وہ کاغذ کہیں گم ہو گیا۔ حافظے میں اگرچہ کچھ چیزیں محفوظ ہیں لیکن اب انہیں بھی

Scanned by CamScanner

قلمبند نہیں کرنا چاہتا، اس لیے کہ تخیل کی بلندی، فوٹوگرافی کا انتہائی کمال، دنیا کے سب سے بڑے اسکرینوں پر پیش کردہ حسین ترین تخیلی اور حقیقی مناظر دیکھنے کی چیزیں ہیں، صرف پڑھنے یا سننے کی نہیں۔ لفظ و بیان کا ہر جادو کیمرے کی جادوگری کی سچی تصویر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ٹرین، آبی اور ہوائی جہاز، شہر، دریا، سمندر، چرندے، درندے، پرندے، کروڑوں سال پہلے کے دیو قامت جانور، سمندروں کی تہ، تاروں کی دنیا، برف پوش پہاڑ، مترنم آبشار، لہلہاتے سبزہ زار...... جو مسحور کن منظر بھی پیش کیا گیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیکھنے والا خود اس کا جز ہے۔ ایک تھیٹر کا وسیع ہال ہو اور چوطرفہ گولائی میں دو گز چوڑی اسکرین، ایک جہاز اڑ رہا ہو اور مناظر سامنے سے آتے، دائیں بائیں سے گذرتے اور پیچھے سے رخصت ہوتے نظر آرہے ہوں تو انسان اس کے سوا کیا محسوس کرے گا کہ وہ خود بھی اسی جہاز کا مسافر ہے اور خاص طور پر کینیڈا کی سیر میں یہی صورت تھی۔ غرض یہ کہ انسان خود کو کبھی سمندروں کی تہ میں پاتا ہے، کبھی فضا کی پہنائیوں میں، کبھی اس خیال سے لرز جاتا ہے کہ ہوائی جہاز کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی سامنے آتی ہوئی چوٹی سے ٹکرا نہ جائے، کبھی اپنی گردن کو ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کرلیتا ہے، اس خوف سے کہ ایک گز کے فاصلے تک پہنچ جانے والا ہیبت ناک دیوا اپنے لمبے لمبے ناخونوں سے اس کا منہ نہ نوچ لے۔ شیر جست لگا کر آگ کے سرکل میں سے نکلتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم پر گرا۔

اس میں کینیڈا، میکسیکو، انگلینڈ، فرانس، چین، جاپان اور دوسرے ممالک کی سیر بھی کرائی گئی ہے۔ ہر ملک کے قدرتی اور شہری مناظر اور قابلِ دید مقامات اس خوبصورتی سے دکھائے گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص خود جا کر ان ممالک کی سیر کرنا چاہے تو اس کے لیے ان تمام مقامات کو دیکھنا ممکن ہی نہیں جو یہاں دکھا دئے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ ڈزنی ورلڈ کا جو منظر بھی دیکھو ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست'' (کرشمہ دل کا دامن کھینچ کر کہتا ہے کہ ٹھہرو، یہی چیز دیکھنے کی چیز ہے)۔

اس کے بارے میں ٹائم میگزین کے الفاظ یہ ہیں:

"America's biggest tourist attraction"

(سیاحوں کے لیے امریکہ کی عظیم ترین تفریح گاہ)

میرے خیال میں کسی نے امریکہ کی سیر کی اور ڈزنی ورلڈ نہ دیکھا تو گویا کچھ بھی نہ دیکھا۔

میامی سے کی ویسٹ

۳/جولائی ۱۹۸۶ء

کی ویسٹ (Key West) میامی سے ۱۵۰ میل دور ہے۔ یہ ساؤتھ ویسٹ میں امریکی سرزمین کی آخری سرحد ہے۔ اس کے بعد ایٹلانٹک کی میکسیکو گلف ہے اور کیوبا یہاں سے ۹۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ سمندر پر بنا ہوا ایک سات میل لمبا پُل کی ویسٹ کو امریکہ کے دوسرے حصوں سے ملاتا ہے۔ یہاں بہت سے امریکی صدور کے مکانات ہیں، اگرچہ ان میں ان کی رہائش نہیں۔

ہمارے میزبان افروز نے جن کی گاڑی پر ہم کی ویسٹ گئے تھے، ساحل پر کھڑے ہوئے بتایا کہ یہاں سے پانچ چھ سو میل کے فاصلے پر ایٹلانٹک میں ایک مثلث حصہ ہے جسے برموداٹرائنگل (Burmuda Triangle) کہا جاتا ہے۔ اس پر سے جو بھی گذرے وہ سمندر میں ڈوب جاتا ہے، خواہ وہ پانی کا جہاز ہو یا ہوائی جہاز۔

درین ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

(اس بھنور میں ہزار کشتیاں ڈوبی ہیں جن کا ایک تختہ بھی کنارے پر نہ آیا)

اس علاقے کی حدود مقرر کر دی گئی ہیں۔ پانی کا جہاز ہو یا ہوائی جہاز، اس سے کترا کر نکلتے ہیں۔ اس کا راز آج تک معلوم نہ ہو سکا، جو معلوم کرنے گیا واپس نہ آیا۔ "کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد" (جسے خبر ہوئی پھر اس کی خبر نہ ملی)۔

۴ر جولائی ۱۹۸۶ء

آج کی تاریخ میں امریکہ کا جشنِ آزادی منایا جاتا ہے اور عام تعطیل ہوتی ہے۔ اس مرتبہ صد سالہ جشن آزادی تھا۔ سب سے بڑی تقریب نیویارک میں مجسمۂ آزادی (Statue of Liberty) کے نزدیک منائی جاتی ہے۔ ہم نے بھی ہوسٹن میں شارپس ٹاؤن کے ایک میدان میں پہنچ کر یہ تقریب دیکھی۔ پورے ملک میں ہر جگہ آتش بازی چھوڑی جاتی ہے، جیسے پاکستان میں یوم آزادی (۱۴ر اگست) کے موقع پر، لیکن امریکہ اور پاکستان میں جو فرق ہے وہی فرق یہاں اور وہاں کی آتش بازی کا ہے، دونوں کا کیا مقابلہ!

ہوسٹن سے لاس اینجلس

یونیورسل اسٹوڈیو

۷ر جولائی ۱۹۸۶ء

پیر کو میں اہلیہ کے ہمراہ شام کے سوا چار بجے ہوسٹن سے لاس اینجلس کے لیے روانہ ہوا۔ فی کس ۵۸ ڈالر آمدورفت کا ٹکٹ تھا۔ تین گھنٹے دس منٹ کا سفر طے کر کے لاس اینجلس پہنچے اور گھڑی کو دو گھنٹے پیچھے کیا۔ اظہر کے دوست مسرور صاحب کے بھائی ضیاء الزماں صاحب ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے مکان پر پہنچے جو ایئرپورٹ سے ۴۵ میل دور ڈوارٹی (Duarte) شہر میں واقع ہے۔

لاس اینجلس ایک کاؤنٹی (ڈسٹرکٹ) ہے، جو ۳۵ شہروں پر مشتمل ہے۔ ہر شہر ایک دوسرے سے اس طرح ملا ہوا ہے جیسے ایک شہر کے مختلف محلے۔ محلوں کے بجائے ان کو شہر اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہر شہر کی انتظامیہ، عدالتیں اور کارپوریشن وغیرہ جدا جدا ہیں۔ لاس اینجلس سرسبز میدانوں، پہاڑوں اور وادیوں میں واقع خوبصورت شہر ہے، لیکن یہاں میامی جیسی ہریالی نہیں۔ ان دنوں یہاں بارش نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مقامات پر سبزہ اور جھاڑیاں جلی ہوئی ہیں۔ صبح کے وقت بڑی خوشگوار ٹھنڈک ہوتی ہے۔

۸ر جولائی ۱۹۸۶ء

خیال تھا کہ آج یونیورسٹی جا کر اصول فقہ کے عربی مخطوطات دیکھو گا، لیکن مسرور صاحب کے دوست مرزا اسلم بیگ صاحب کو دو دن تک فرصت نہیں اور انہی کے ساتھ یونیورسٹی جانا طے ہے، اس لیے آج یونیورسل اسٹوڈیو دیکھنے چلے گئے۔ ضیاء الزماں صاحب نے دفتر جاتے ہوئے ہمیں اسٹوڈیو کے گیٹ پر چھوڑا۔

۱۵ ڈالر فی کس ٹکٹ لے کر ٹھیک آٹھ بجے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے اور ٹرام میں بیٹھ کر اسٹوڈیو کا چکر لگایا۔ یہ اسٹوڈیو ایک خوبصورت پہاڑی کے طویل و عریض رقبے میں واقع ہے۔ ٹرام میں گھومتے ہوئے شہر کے مناظر بھی دیکھے۔

راستے میں ایک روبوٹ کھڑا تھا، جس سے گائڈ نے چوراہا کراس کرنے کی اجازت طلب کی۔ پھر ٹرام ایک ہال میں داخل ہوئی جہاں تاریکی کر کے کھڑے ہوئے متعدد روبوٹ اور پستول سے جنگ کے مناظر دکھائے گئے۔ وہاں سے روانہ ہو کر ایک تھیٹر کے سامنے ٹرام سے اترے اور ایک ہال میں پھر دوسرے میں داخل ہو کر مختلف فلمیں دیکھیں۔ ان فلموں میں بتایا گیا کہ مختلف مناظر کو کس طرح فلمایا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کی پرواز، راکٹ سے نکل کر فضا پیماؤں کا فضا میں تیرنا، ہوائی جہاز میں آگ لگنا اور اس کا گرنا، سائیکلوں کا سڑک پر جاتے جاتے اڑنا اور پہاڑوں کی بلندیاں طے کرنا جبکہ انہیں صرف پیڈلوں سے چلایا جا رہا ہے، عمارتوں میں آگ لگنا، کنگ کانگ کا کھڑے ہو کر دھاڑنا، لکڑی کے پرانے پل کا ٹرام گذرنے پر ٹوٹنا، یہ تمام مناظر بتائے گئے۔ اسکرین پر معلوم ہوتا ہے کہ سارے مناظر اصلی ہیں، درانحالیکہ یہ مختلف کمروں میں فلمائے جاتے ہیں اور فوٹو گرافی کی جدید تکنیک مجاز کو حقیقت کا سارنگ دے دیتی ہے۔

چوں کہ آرلینڈو میں ایپکاٹ سینٹر دیکھ چکے تھے اس لیے یہ جگہ زیادہ پسند نہ آئی، تاہم حسب ذیل مناظر اچھے تھے:

☆ ایک جگہ یہ منظر بتایا گیا ہے کہ سمندر اس طرح پھٹا تھا اور حضرت موسیٰؑ اس طرح

گذرے تھے۔ ہماری ٹرام پانی کے بیچ میں سے گذری اور دونوں طرف آبشار بنادیا گیا تھا۔

☆ ایک جگہ پہاڑ سے بنا کر ان پر سفیدی کردی گئی ہے، گویا برف پوش پہاڑ۔ ٹرام ان کے اندر ایک سرنگ میں داخل ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اندر گول دیواروں پر المونیم کی چادریں چڑھی ہوئی ہیں، جیسے برف پوش اصلی چٹانیں ہوں۔ ان چادروں کو گھماتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ پوری ٹرام چکر کھارہی ہے۔

☆ ایک تالاب ہے جس میں ایک طرف چھوٹا سا جہاز بھی کھڑا ہے اور ایک جگہ ایک مصنوعی آدمی کشتی پر بیٹھا مچھلی پکڑ رہا ہے۔ دھات کی بنی ہوئی ایک بڑی سی وھیل مچھلی ہے، وہ تالاب میں گھمائی جاتی ہے۔ کشتی کے پاس سے گذرتی ہے تو کشتی ڈوب جاتی ہے پھر چکر لگا کر منہ پھاڑے، دانت نکالے ٹرام کے پاس سے گذرتی ہے۔ خوفناک فلم ''جاز'' اسی تالاب میں بنائی گئی اور فلم دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ سارے کرشمے حقیقی سمندر میں اصلی وھیل کے ہیں۔

☆ ایک تالاب کے وسط میں ایک بڑا سا ڈرم پڑا ہے۔ اس کی مسلسل حرکت سے لہریں پیدا ہوتی ہیں اور فلم میں انہی لہروں کو سمندر کی خوفناک موجیں بنا کر پیش کردیا جاتا ہے۔

شام کو ساڑھے چھ بجے ضیاء الدین ہمیں لینے آگئے۔

چڑیا گھر کی سیر

۹/ جولائی ۱۹۸۶ء

خیال تھا کہ آج ڈزنی لینڈ دیکھیں گے، لیکن ڈاکٹر عارف رضوی نے جنہیں میں نہیں جانتا، صاحبِ خانہ کی رات کی دعوت کی اور ہمیں بھی مدعو کرلیا۔ ڈزنی لینڈ سے واپسی چونکہ رات گئے دیر سے ہوئی اس لیے یہ پروگرام ملتوی کردیا، لیکن گھر میں بیٹھ کر اس کے سوا اور کیا کرتا کہ اسی اکلوتی بیوی سے باتیں کرتا رہتا جس سے ۴۴ سال سے باتیں کرتا اور زیادہ تر سنتا چلا آرہا ہوں۔ اس لیے یہ مناسب سمجھا کہ آج کا دن جانوروں کی صحبت میں گذارا جائے۔

چناں چہ چڑیا گھر کی سیر کو نکل گئے۔ ضیاء صاحب نے دفتر جاتے ہوئے ہمیں ساڑھے سات بجے گیٹ پر اتارا۔ دس بجے گیٹ کھلا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ پانچ سال سے اوپر کے بچوں کا ڈیڑھ، بڑوں کا چار اور ۶۵ سال سے اوپر کے لوگوں کا تین ڈالر فی کس ٹکٹ تھا۔ میں نے یہ حساب لگا کر کہ نو ڈالر کے دو ٹکٹ ہوں گے دس ڈالر کا نوٹ دیا، اس نے مجھے اور بیوی کو غور سے دیکھا اور ٹکٹ کے ساتھ چار ڈالر واپس کر دیئے۔ چلو واقعۃً نہ سہی اس کی نظر میں تو ہم ۶۵ کے ہو ہی گئے۔

اس چڑیا گھر میں اگر دو چیزیں نہ دیکھتے تو نتیجہ اس سے مختلف نہ ہوتا کہ پیسے بھی صرف کئے اور تھکان بھی مول لی۔

۱۔ ببر شیر اور دیسی شیر کے علاوہ زندگی میں پہلی بار سفید شیر دیکھا جس کے جسم پر اوپر سے نیچے کتھئی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ سفید شیر اور دوسرا دھاری دار بھورا سرخی مائل دیسی شیر ایک ہی جگہ تھے۔

۲۔ مختلف اقسام کے سانپ دیکھے۔ سانپوں کی اتنی قسمیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔ ۸۷ قسم کے سانپ تو میں نے خود شمار کئے اور تقریباً دس خانے خالی تھے جن میں سے ایک کے اندر لکھا تھا: (ترجمہ) ”آپ کے خیال میں کیا یہ سانپ لنچ کرنے گیا ہے؟ نہیں اس کے گھر کی صفائی کے لیے اسے نکال لیا گیا ہے“۔ دوسرے جو خانے خالی تھے شاید انہیں بھی اسی غرض سے خالی کیا گیا ہو۔ پانی میں مچھلی اور خشکی پر سانپ، جتنی اقسام ان کی ہیں کسی اور جاندار کی نہیں۔

۱۰/ جولائی ۱۹۸۶ء

پروگرام کے مطابق آج سلیم بیگ صاحب کے ہمراہ یونیورسٹی (UCLA) گیا۔ وسیع و عریض رقبہ، شاندار عمارتیں، سایہ دار درخت، شاداب لان، جابجا پتھر کے مجسمے...... غرض یہ کہ یونیورسٹی اپنے نام کی طرح واقعی ایک دنیا ہے۔ دریافت کرتے کرتے لائبریری پہنچے۔ ریسرچ لائبریری کے مشرق قریب کے ببلیوگرافر مسٹر ڈننگ ایس ولسن

(Mr. Dunning S. Wilson, Near East Bibliographer) صاحب کا فون نمبر معلوم کیا ان سے فون پر گفتگو کی۔ معلوم ہوا کہ آج تو بہت مصروف ہیں، کل ملاقات ہو سکے گی۔ ان سے کہا گیا کہ میں سعودی عربیہ سے آیا ہوں۔ اگر وقت نکال سکتے ہوں تو صرف پانچ منٹ کے لیے ملاقات کرلیں۔ جواب دیا: ایک میٹنگ کے سلسلے میں نیچے ہی آرہا ہوں، آپ سے بھی ملاقات کئے لیتا ہوں۔ چناں چہ نیچے آئے۔ کھڑے کھڑے بڑے اخلاق سے بات کی اور کہا کہ آپ نے ۱۲/ جون کو ہوسٹن سے جو خط روانہ کیا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ لیکن میں کیا کروں، موضوعات کے اعتبار سے کتابوں کی فہرست یہاں تیار نہیں (میں نے ہوسٹن سے ۱۲/ جون کو شمالی امریکہ اور کینیڈا کی ۲۱ یونیورسٹیوں کو خطوط روانہ کئے تھے کہ اصول فقہ کے جو عربی مخطوطات آپ کے پاس موجود ہیں مجھے ان کی فہرست چاہئے)۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سارے مخطوطات کی فہرست کی زیروکس کاپی مجھے ہوسٹن روانہ کر دیں گے۔ اپنا کارڈ بھی دیا کہ ان سے فون پر رابطہ قائم کر سکوں۔ اس یونیورسٹی میں عربی کے پانچ ہزار مخطوطات ہیں۔

ساڑھے گیارہ بجے بیگ صاحب ہی کے ہمراہ گھر واپس آگیا اور باقی دن گھر ہی پر گذارا۔

۱۱/ جولائی ۱۹۸۶ء

آج ڈزنی لینڈ کی سیر کی۔ والٹ ڈزنی نے پہلے ڈزنی لینڈ ہی بنایا تھا، اس کے بعد ڈزنی ورلڈ۔ گویا یہ نقش اوّل ہے۔ نقش ثانی اگرچہ نقش اوّل سے بہتر ہوتا ہے تاہم نقش اوّل بھی خوب ہے۔ بیوی کو گڑیوں کا شو سب سے زیادہ پسند آیا اور مجھے فضائی پہاڑ (Space Mountain) کا خوفناک سفر، گھپ اندھیرے میں دہشت انگیز برق رفتاری سے جب نامعلوم منزل کی طرف یہ سفر شروع ہوتا ہے تو دائیں بائیں اوپر نیچے تنگ موڑ کاٹتے ہوئے عورتوں اور بچوں کی چیخیں بند ہی نہیں ہوتیں۔ بیوی آنکھیں بند کیے گردن جھکائے سہمی ہوئی بیٹھی رہیں اور کہکشاں کی روشن اور خوبصورت دنیا بھی نہ دیکھ سکیں۔ نیچے آکر بھی جب تک ہم نے "امریکا کی سیر" کا حسین شو نہ دیکھ لیا ان کا موڈ خراب ہی رہا۔

ڈزنی لینڈ میں صرف "میجک کنگڈم" ہے اور ڈزنی ورلڈ میں "ایپکاٹ سینٹر" بھی۔ ڈزنی ورلڈ دیکھ لینے کے بعد ڈزنی لینڈ دیکھنا بے سود ہے۔ ہم نے چوں کہ ڈزنی ورلڈ کے میجک کنگڈم کا بہت کم حصہ دیکھا تھا اس لیے ڈزنی لینڈ دیکھ کر کسی درجے میں اس کی تلافی کی۔

ڈزنی لینڈ کا ٹکٹ لینے میں یہ صورت پیش آئی کہ اس نے مجھ سے فی کس پر ساڑھے تینتیس ڈالر لیے۔ رات کو جب دورانِ گفتگو ضیاء صاحب کے سامنے ذکر آیا تو انھوں نے کہا: ٹکٹ تو فی کس تقریباً ۱۷ ڈالر ہے۔ ٹکٹ کا جو نصف حصہ میرے پاس موجود تھا اسے دیکھا تو واقعی ساڑھے سولہ ڈالر فی کس ٹکٹ تھا۔ امریکہ میں یہ بھی ہوتا ہے!

ہنٹنگٹن لائبریری، لاس اینجلس

۱۲، ۱۳ر جولائی ۱۹۸۶ء

یہ لائبریری ہنری۔ ای۔ ہنٹنگٹن (Henry E. Huntington) کی قائم کردہ ہے۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی اس میں اضافہ کیا۔ لائبریری میں چھ لاکھ مطبوعہ کتابیں ہیں اور مخطوطات، فوٹو گرافس اور پرنٹس کی تعداد کئی ملین ہے۔ اس طرح کا اتنا ذخیرہ امریکہ میں کسی دوسری جگہ موجود نہیں۔

۲۰۷ ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا ایک نہایت حسین اور بے نظیر باغ بھی ہے۔ ان درختوں کے سوا جن کے پھل کھائے جاتے ہیں دنیا کے مختلف خِطّوں کی کوئی جھاڑی یا درخت ایسا نہیں جو یہاں موجود نہ ہو۔ ہر جھاڑی اور درخت پر چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی ہوئی ہیں، جن میں ان کے نام اور مقام لکھے ہوئے ہیں۔ ایک حصہ جو گلاب کا باغ (Rose Garden) کہلاتا ہے، اس میں گلاب کی بارہ سو اقسام ہیں جنھیں تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے لگایا گیا ہے۔

دراصل یہ باغ ان لوگوں کے لیے لگایا گیا ہے جو نباتیات (Botany) کے موضوع پر تحقیق کا ذوق رکھتے ہوں۔ عام زائرین کے لیے بھی بہترین تفریح کا ایسا حسین امتزاج اور

کہیں نہیں دیکھا۔

۱۲/ جولائی کو اس کی تفریح سے طبیعت سیر نہ ہوئی تھی اس لیے ۱۳/ جولائی کو دوبارہ گئے اور ایک بجے سے ساڑھے چار بجے تک کا وقت یہیں گذارا۔ کئی خوبصورت مناظر کے فوٹو بھی لیے اور کچھ دیر گھنے درختوں کی چھاؤں میں سبزہ کے مخمل پر سفید چادر بچھا کر آرام بھی کیا۔

یہ لائبریری صرف ایک سے ساڑھے چار بجے تک کھلتی ہے۔ کوئی فیس نہیں، صرف پارکنگ کے دو ڈالر لیے جاتے ہیں، وہ بھی اگر کوئی نہ دے تو کوئی جبر نہیں۔ لیکن امریکی قوم کے مزاج کے خلاف ہے کہ وہ اس طرح کی فیس کو نظر انداز کر دیں۔

۱۳/ جولائی ۱۹۸۶ء

شام کو چھ بجے ہالی وڈ (Hollywood) کی سیر کے لیے ضیاء صاحب کے ساتھ نکلے۔ یہ دراصل ایک سٹی ہے۔ یہاں کی عام دلچسپی کا منظر وہ سڑک ہے جسے ہالی وڈ بولیورڈ (Hollywood Blouverd) کہتے ہیں۔ بہت صاف ستھری سڑک ہے۔ مزیّن دوکانیں، خوشنما عمارتیں اور ایک سائز کے تراشے ہوئے درختوں کی دو رویہ قطاریں اچھا منظر پیش کرتی ہیں۔ اسی سڑک پر چائنیز تھیٹر ہے، جس کے بیرونی حصے میں ہالی وڈ کے مشہور اداکاروں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اداکاروں سے دلچسپی رکھنے والے خاصے لوگ وہاں جمع تھے۔ ضیاء صاحب نے کہا کہ آپ بھی اتر کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا: ان چیزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہالی وڈ سٹی میں اسٹوڈیوز کی کثرت ہے، انہی میں سے ایک یونیورسل اسٹوڈیو بھی ہے جسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ ہالی وڈ سڑک کی رونق اس زمانے میں عروج پر تھی جب فلمی اداکار بھی یہاں رہا کرتے تھے۔ سر شام جب وہ چہل قدمی کے لیے نکلتے تو انہیں دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ سنا ہے اچھے اداکاروں نے اپنی رہائش یہاں سے منتقل کر لی ہے، تاہم تھیٹروں کی کثرت نے اس سڑک کی رونق کو برقرار رکھا ہے۔ سر شام ہی سے رنگین مزاج زندہ دلوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور جوں جوں رات بھیگتی

ہے ہجوم بڑھتا ہی جاتا ہے۔ پارکنگ کی جگہ پانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ دیکھا نہیں، صرف سنا ہے کہ وہ منظر بھی بڑا حسین ہوتا ہے جب کثیر تعداد میں سڑک کی تیز دودھیا روشنیاں رات کو دن بنا دیتی ہیں۔

ہالی وڈ دیکھنے کے بعد ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈاؤن ٹاؤن کا چکر لگایا۔ مغرب کے وقت برماؤنٹ ایوینیو ۴۳۴۴ میں اسلامک سینٹر پہنچے اور وہیں مغرب کی نماز ادا کی۔ جماعت میں ۲۰، ۲۵ شرکاء تھے، جن میں عربوں کی اکثریت تھی۔ امام بھی عرب ہی تھے، شکل وصورت سے شامی یا فلسطینی نظر آتے تھے۔

ڈاؤن ٹاؤن سے گذرتے ہوئے وہ "ایمبیسیڈر ہوٹل" بھی دیکھا جس میں جان۔ ایف۔ کینیڈی کے بھائی رابرٹ کینیڈی کو ان کی الیکشن کی مہم کے دوران قتل کیا گیا تھا۔

رات کو نو بجے گھر پہنچے۔ تفریح کے لحاظ سے یہ دن اچھا گذرا۔

۱۴ر جولائی ۱۹۸۶ء

صبح سات بجے لاس اینجلس سے روانہ ہوئے اور تین گھنٹے میں ہوسٹن پہنچے۔

ہوائی جہاز سے ابر کا منظر دیکھنے کی چیز ہے۔ سورج کی روشنی میں یوں معلوم ہوتا ہے گویا روئی کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ ہوسٹن آتے ہوئے یہ ابر پارے اتنے نیچے تھے گویا زمین پر برف کے درخت اُگے ہوں۔

۲۵ر جولائی ۱۹۸۶ء

ہوسٹن میں کئی حضرات نے مجھ سے جمعہ کی نماز (ڈاؤن کے علاوہ دوسری جگہ) پڑھانے کی خواہش ظاہر کی، لیکن میں نے ہر ایک سے معذرت کرلی۔ کل رات مسجد کے امام حافظ محمد اقبال صاحب کا، جو نیو ٹاؤن، کراچی کے فارغ التحصیل ہیں، فون آیا کہ ۲۵ر کو جمعہ کی نماز آپ پڑھائیں (مون مسٹ (Moonmist) کی مسجد میں)، میں نے ان سے بھی معذرت کرلی۔ پھر موصوف نے کہا کہ کم از کم مغرب سے عشاء تک مسجد میں درسِ قرآن دے دیں۔ مجھے شرم آئی کہ اس کے لیے بھی معذرت کرلوں۔ چناں چہ اقرار کرلیا اور

موصوف نے جمعہ کی نماز کے بعد اس کا اعلان بھی کر دیا۔ مغرب کے بعد سورۂ نباء کی تلاوت کر کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس کی تفسیر بیان کی۔ اس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن اس گفتگو کو درمیان ہی میں منقطع کر کے عشاء کی نماز سے فراغت حاصل کر لی گئی اور نماز کے بعد سوالات کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ بمشکل بارہ بجے رات کو یہ سلسلہ ختم ہوا۔

سوالات یہ تھے :

۱۔ کیا اہلِ کتاب کا ذبیحہ جائز ہے ؟

۲۔ کسی اجنبی مسلمان کی دعوت میں جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ حلال گوشت کا اہتمام کرتا ہے، کیا اس سے یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ یہ گوشت حلال ہے یا نہیں ؟

۳۔ گرین کارڈ حاصل کرنے کے لیے کسی امریکی عورت سے شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو طلاق دینا ضروری ہے۔ کیا اس طرح اسے ہمیشہ کے لیے طلاق ہو جائے گی ؟

۴۔ کیا یہاں سود پر چیزیں خریدنا جائز ہے ؟

۵۔ کیا یہ جائز ہے کہ ایک امام کی تقلید چھوڑ کر کسی مسئلہ میں دوسرے امام کی تقلید کر لی جائے ؟

۶۔ گرین کارڈ کی خاطر ایک عیسائی امریکی عورت سے شادی کی تھی۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی بھی پیدا ہوئے، اس کے بعد طلاق ہو گئی۔ بچوں کو قانوناً ماں سے لے نہیں سکتے، لیکن یہ بھی یقین ہے کہ وہ انہیں عیسائی بنائے گی۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے ؟

۷۔ دفتر میں ظہر کی نماز کا وقت نہیں ملتا، کیا اسے گھر آکر عصر کی نماز کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے ؟

۸۔ رمضان اور عید کے لیے سعودی عربیہ کی رویت کا اعتبار ہونا چاہیے یا مقامی رویت کا ؟

۹۔ اگر سعودی عربیہ کی رویت اور مقامی رویت میں اختلاف ہو تو شبِ قدر کا تعین کس طرح ہو ؟

۱۰۔ کیا یہاں سود پر چیزیں خریدنے والے کی اور شیعہ کی اقتداء جائز ہے؟

میں نے اپنے علم کے مطابق ان مسائل کے جوابات دیئے، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ حضرات محض دنیا کی خاطر خود تو اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد چاہتے یہ ہیں کہ آپ تو اپنے حال پر قائم رہیں اور آپ کی خاطر اسلامی قوانین میں تبدیلی کر دی جائے۔ میں نے حلال و حرام کے سلسلے میں یہ بھی کہا کہ جن چیزوں کا حلال یا حرام ہونا واضح ہے ان میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں اور مشتبہات میں بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ حتی الوسع ان سے پرہیز کیا جائے۔

میں نے مذکورہ سوالات اس لیے تحریر کر دیئے کہ اگر کوئی عالم امریکہ کا دورہ کرے تو اسے پہلے سے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ اس سے یہاں اس قسم کے سوالات کئے جائیں گے۔

یکم راگست ۱۹۸۶ء

ایک صاحب کا فون آیا کہ لوگوں کی خواہش ہے کہ آپ یکم اگست کو اسلامک سینٹر کی خاص (Main) مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا دیں۔ شرم آئی کہ اپنے انکار پر قائم رہوں۔ چناں چہ وہاں جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔

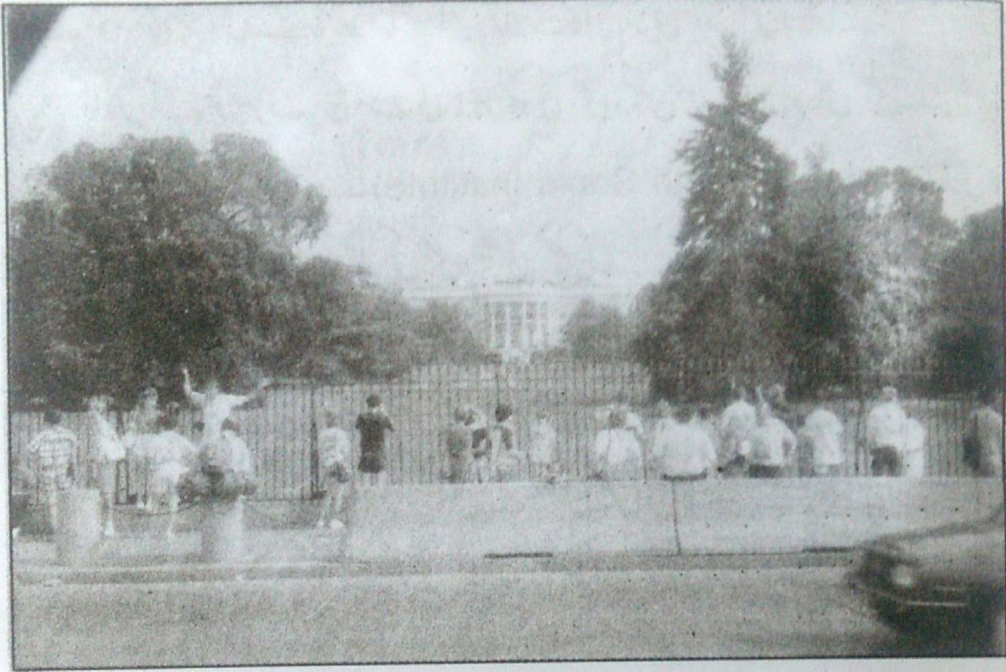
۴راگست ۱۹۸۶ء

صبح چار بجے ایسٹرن ایئر لائن کی مون لائٹ فلائٹ سے روانہ ہو کر سات بجے کے قریب واشنگٹن (ڈلس) پہنچے۔ دو بیڈ والے ایک کمرے کے ایک رات کے ۹۵ ڈالر ادا کئے۔ ہوٹل ہی سے ۱۸ ڈالر فی کس کے حساب سے کل ساڑھے چھ گھنٹے کے ٹور کے لیے ایک ٹورسٹ بس کا ٹکٹ لیا۔ آج شام کا وقت خالی تھا، سوچا کہ واشنگٹن مانیومنٹ (یادگار) دیکھ لیا جائے۔ وہائٹ ہاؤس کے قریب سے گذرتے ہوئے منزل مقصود پر پہنچے۔ اس مینار پر چڑھنے کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ لائن میں کھڑے ہو گئے اور تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اوپر چڑھنے کی نوبت آئی۔ اوپر سے پورے واشنگٹن کا منظر صاف نظر آتا ہے۔ تاریکی میں روشنیاں بڑی خوبصورت

نظر آئیں۔ ایسا محسوس ہوا گویا ہم کہکشاں کے درمیان کھڑے ہوں۔

۵ر اگست ۱۹۸۶ء

صبح پونے نو بجے گرے لائن کی بس سے ٹور پر روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے وہائٹ ہاؤس پہنچے۔ ڈرائیور نے کہا کہ سب لوگ ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجائیں۔ بڑی لمبی لائن تھی۔ ہم جب کاؤنٹر کے قریب پہنچے تو اعلان ہوا آج کے ٹکٹ ختم ہو چکے۔ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔



امریکہ، واشنگٹن، وہائٹ ہاؤس

وہائٹ ہاؤس قدیم طرز کی ایک عمارت ہے اور قدیم طرز کا لحاظ ہو تو اسے خوبصورت بھی کہا جاسکتا ہے۔ واشنگٹن میں جدید طرز کی اس سے کہیں زیادہ خوبصورت عمارتیں موجود ہیں لیکن مکان کی عزت مکین سے ہوتی ہے۔ اپنے بیرونی منظر کے اعتبار سے یہ معمولی سی عمارت دنیا کی سب سے زیادہ بااقتدار ہستی کا مسکن ہے، وہ ہستی جس کے صرف ایک بٹن سے دنیا بھک سے اُڑ سکتی ہے۔ اندر سے اس عمارت کی شان و شوکت کیا ہو گی۔ اسے دیکھ لیتے تو اچھا ہوتا لیکن نہ دیکھنے کا افسوس بھی نہیں ہوا۔

بس وہائٹ ہاؤس سے کیپیٹل بلڈنگ کی طرف روانہ ہوئی اور ڈرائیور نے کہا کہ ہم سوا

گھنٹے میں واپس آجائیں۔ لائن میں کھڑے ہو گئے۔ سیڑھیوں پر پہنچے تو حضرت عیسیٰ کا مجسمہ تھا۔ بلڈنگ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہاتھ کے سامان کی چیکنگ ہوئی اور کیمرے رکھوا لیے گئے۔ یہ اعلان بھی ہوا کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی خطرناک ہتھیار ہوا تو اُسے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اندر جانے کے لیے اسی طرح گذارا گیا جس طرح ایئرپورٹ میں داخل ہوتے وقت گذارا جاتا ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی خطرناک چیز ہو تو ٹی وی اسکرین پر ظاہر ہو جائے۔ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ اس عمارت کا اہم ترین حصہ بھی دیکھا۔

واپس آئے تو صرف پانچ منٹ کی تاخیر ہوئی تھی، لیکن بس روانہ ہو چکی تھی۔ اس بس سے ہمیں اسمتھ سونیو انسٹی ٹیوٹ (Smeth Sonio Institute)، جان ایف کینیڈی کا مقبرہ اور جیفرسن اور لنکن کی یادگاریں بھی دیکھنی تھیں۔

مجھے ڈائناسور کا ڈھانچہ دیکھنے کا اشتیاق تھا، اس لیے ٹیکسی لے کر ہم انسٹی ٹیوٹ پہنچے اور وقت کی تنگی کی وجہ سے اس کی تین عمارتوں میں سے صرف وہ عمارت دیکھی جو قدرتی تاریخ (Natural History) پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈائناسور کے ڈھانچے کے ساتھ ساتھ قدیم زمانے کے دیو قامت گینڈے اور عظیم الجثہ چمگادڑ کے ڈھانچے بھی ہیں۔ اس



امریکہ، واشنگٹن، ڈائناسور کے ڈھانچے

عمارت میں جو جو کچھ ہے واقعۃً دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی دوسری دو بلڈنگوں میں کیا کیا کچھ ہو گا، اسے اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک بجے کے قریب ہوٹل پہنچے، حلال کھانا جو بھی مل سکا اس سے پیٹ کی آگ بجھائی، سامان اٹھایا اور ٹیکسی لے کر لائبریری آف کانگریس پہنچے۔ یہ لائبریری بھی تین عظیم الشان عمارتوں میں واقع ہے۔ میں صرف دو عمارتوں کے اندر جاسکا، گویا نام لگالیا کہ میں نے بھی یہ لائبریری دیکھی ہے۔ لاء لائبریری (Law Library) پہنچ کر اپنی ایڈٹ کی ہوئی تین کتابیں پیش کیں اور واپس آگیا اور اسی کے ساتھ ساتھ واشنگٹن کی سیر بھی ختم ہو گئی۔ ٹرین سے روانہ ہو کر تقریباً نو بجے رات کو ٹرینٹن (Trenton) پہنچے جو نیو جرسی اسٹیٹ کا صدر مقام ہے۔ اسٹیشن سے شاہت صاحب کو فون کیا، وہ بیس منٹ میں گاڑی لے کر آگئے۔

۶ / اگست ۱۹۸۶ء

آج شاہت صاحب کے بھائی اویس صاحب نے پرنسٹن پہنچایا جو گھر سے تقریباً تیس میل دور ہے۔ وسیع و عریض رقبے میں پھیلی قدیم نقش و نگار سے مزیّن پرنسٹن یونیورسٹی دیکھی۔ یونیورسٹی لائبریری کے اس حصے میں گیا جہاں عربی کے بارہ ہزار مخطوطات کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ میں نے ان کے مطبوعہ کیٹیلاگ نکال کر اسسٹنٹ لائبریرین کو بتایا کہ مجھے گیرٹ کلیکشن اور یہودا کلیکشن کے اصولِ فقہ کے فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک کی زیروکس کاپیاں مطلوب ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ کل مل جائیں گی۔ ٹرینٹن سے دوبارہ پرنسٹن آنا دشوار تھا، اس لیے میں نے کہا کہ میرے ہوسٹن کے پتہ پر روانہ کر دی جائیں۔ انہوں نے وعدہ کیا۔ وعدہ کے مطابق یہ کاپیاں مجھے سعودیہ بھیج دی گئیں۔

۷ / اگست ۱۹۸۶ء

شاہت صاحب کے ساتھ گاڑی میں نو بجے صبح نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ گاڑی شاداب راستے اور دو طرفہ گھنے جنگلوں سے گذر رہی تھی۔ بڑا پُر کیف منظر تھا۔ نیو جرسی اسٹیٹ بڑی سرسبز و شاداب ہے اور نیو جرسی ہی پر موقوف نہیں، امریکہ کا پورا شمالی علاقہ

جنوبی علاقے سے زیادہ خوبصورت ہے۔ شمال کی طرف جوں جوں بڑھتے جائیں اس کے قدرتی جمال میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ کینیڈا پہنچ جائیں تو وہ شمالی امریکہ سے بھی زیادہ حسین ہے۔

نیو جرسی میں خرگوش اور ہرن بکثرت ہیں۔ جس سڑک سے ہم گذر رہے تھے، شباہت صاحب نے بتایا کہ کبھی کبھی ہرن اس راستے پر بھی آجاتے ہیں۔ چوں کہ شکار ممنوع ہے اس لیے موت کا خوف نہیں، جنگلوں میں رہیں یا سڑکوں پر دندنائیں۔ اگر کوئی ہرن گاڑی کی زد میں آجائے تو اس کی رپورٹ درج کرانا اور مردہ ہرن کو حکومت کو پیش کرنا ضروری ہے۔

نیو جرسی کی حدود سے گذر کر ہم نیویارک کی حدود میں پہنچے اور لنکن سرنگ (Lincoln Tunnel) سے گذرتے ہوئے، جو سمندر کے بیچ میں بنائی گئی ہے، اس مشہور جزیرے میں پہنچے جو مین ہاٹن (Manhattan) کہلاتا ہے۔ یہ جزیرہ امریکہ نے مقامی سردار سے صرف ۲۴ ڈالر میں خریدا تھا اور آج یہ دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے۔

سب سے پہلے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ پہنچے۔ لائن زیادہ لمبی نہ تھی۔ ایک لفٹ نے ۸۰ ویں منزل پر پہنچایا، دوسری نے چھیاسی ویں منزل پر اور تیسری نے ۱۰۲ منزل پر۔ یہ بلڈنگ امریکہ کی تیسری سب سے اونچی عمارت ہے۔ سب سے اونچی عمارت شکاگو میں ہے جو شاید ۱۱۴ منزل بلند ہے۔ دوسری نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت ہے جو ۱۰۸ منزل کی ہے اور تیسرے نمبر پر ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔ اس منزل سے نیویارک کے اطراف کے تمام جزیروں کو دیکھا۔ اس فاصلے سے ۸۰ میل دور کا علاقہ نظر آتا ہے۔ قریب کی ریاستیں نیو جرسی، پنسلوانیا، کنیکٹیکٹ اور میساچیوسٹس بھی نظر آتی ہیں۔ نیچے دیکھا تو آدمی اتنے چھوٹے نظر آئے گویا بالشتیوں کی آبادی ہو۔ یہ عمارت ۱۴۵۴ فٹ یا ۴۴۳ میٹر بلند ہے۔ ۱۰۲ ویں منزل کی بلندی ۱۲۵۰ فٹ یا ۳۸۱ میٹر ہے۔

اس کے بعد مجسمۂ آزادی (Statue of Liberty) کے لیے روانہ ہوئے اور فیری (بڑی کشتی یا چھوٹا جہاز) پر بیٹھ کر اس جزیرے میں پہنچے جس میں مجسمۂ آزادی بنایا گیا ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا رقبہ ایک چوتھائی میل سے کچھ زیادہ ہے۔ مجسمہ ایک عورت کا ہے جسے قدیم اطالوی، آزادی کی دیوی سمجھتے تھے۔ یہ مجسمہ فرانس میں تیار کیا گیا۔ ایلی ویٹر خراب تھا اور وہاں لکھا ہوا تھا کہ اس کی ۳۵۴ سیڑھیاں طے کر کے اوپر جانے اور واپس آنے میں دو گھنٹے صرف ہوں گے۔ اس کے باوجود لمبی لائن لگی تھی۔ ہم نے اس دیوی کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔

اسی جزیرے میں ہم نے کھانا کھایا اور اس کا میوزیم دیکھتے ہوئے واپس آگئے۔ واپس میں ٹائم اسکوائر (Time Squire) دیکھا۔ یہ ایک بلند مربع عمارت ہے۔ وسط سے کچھ نیچے بلندی پر بلبوں کی ایک چوڑی سی بیلٹ ہے، بلب روشن ہوتے اور ان سے حروف بنتے رہتے ہیں اور دنیا کی تازہ ترین خبریں بتائی جاتی ہے۔ ٹائم اسکوائر دیکھ کر نیویارک پبلک لائبریری گئے۔ میں تنہا اندر گیا اور اپنی تحقیق کردہ تین کتابیں لائبریری میں پیش کیں: "المختصر فی اصولِ الفقہ"، "المغنی" اور "بیان المختصر (جلد اوّل)"۔

نیویارک امریکہ کا سب سے بڑا شہر ہے اور بہت گنجان آباد ہے، خصوصاً وہ جزیرہ جو مین ہاٹن کہلاتا ہے۔ زمین کی کمی کی وجہ سے عمارتیں بلند ہیں اور گاڑیوں کی کثرت کی وجہ سے دھوئیں سے تقریباً سیاہ پڑی ہوئی ہیں۔ فٹ پاتھوں پر دوکانیں اور ٹھیلے دیکھ کر ہمیں کراچی کا صدر یاد آگیا۔ یہاں کالے بھی کثیر تعداد میں ہیں اور لوگ ان سے ڈرتے بھی ہیں۔

۹/اگست ۱۹۸۶ء

آج شباہت صاحب اپنے پورے خاندان کے ساتھ ہمیں لانگ وڈ گارڈن (Long Wood Garden) لے گئے۔ دو کاریں تھیں اور ایک اسٹیشن ویگن۔ کل سولہ افراد تھے۔ یہ گارڈن ٹرینٹن (نیوجرسی) سے تقریباً ستر میل دور پنسلوانیا اسٹیٹ میں واقع ہے۔ ڈیلیویر اسٹیٹ (Delaware State) کے بائیں جانب سے گذرتے ہوئے ہم پنسلوانیا کے اس گارڈن میں پہنچے۔ خیال تھا کہ لاس اینجلس کا ہنٹنگٹن گارڈن دیکھنے کے بعد شاید کوئی گارڈن نظروں میں نہ جچے، لیکن اس گارڈن کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اس سے کہیں فائق ہے۔

اس میں بھی یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف پودے جمع کیے گئے ہیں۔ اس میں خاص چیز وہ کورڈ ایریاز ہیں جنہیں (Conservatories) کہا جاتا ہے اور ان کی تعداد بیس ہے۔ چھت شیشے کی ہے، ہال میں مختلف ملکوں کے پودے لگے ہیں اور ہر جگہ اسی ملک کے موسموں کے لحاظ سے اس کا درجۂ حرارت رکھا گیا ہے۔ یہاں گملوں میں لگے ہوئے چائینز آرٹ کے وہ درخت بھی دیکھے جن کی بلندیاں ایک فٹ، ڈیڑھ فٹ تھیں اور عمریں چالیس سے تین سو سال تک۔ پچر پلانٹ (Pitcher Plant) بھی دیکھا، ایک خوبصورت سا پھول جس میں پروں جیسے دو بازو، نیچے تھیلی، اوپر تتلی جیسا ڈھکن۔ تھیلی اور ڈھکن کے درمیان ایک سوراخ جس میں سے رس نکلتا ہوا، اس کی لالچ میں جیسے ہی کوئی کیڑا آیا، ڈھکن فوراً بند ہو گیا اور پھول نے اس کا رس چوس کر مردہ جسم کو باہر پھینک دیا۔ وقت کی کمی اور ایک ساتھی کے پیٹ کے شدید درد کی وجہ سے ہم پورا گارڈن نہ دیکھ سکے، لیکن جو دیکھا وہ بھی خوب تھا۔

یہ باغ پیرس ڈوپونٹ (Peirce Du Pont) کی ملکیت ہے۔ اس میں ان کا مکان بھی ہے۔ اس باغ کا سالانہ صرفہ 10.5 ملین ڈالر ہے، جس کا ساٹھ فیصد ڈوپونٹ ادا کرتے ہیں، چالیس فیصد ٹکٹوں کی فروخت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں ۱۹۰ ہمہ وقتی، ۸۰ جزوقتی ملازم اور ۴۰ طلبہ کام کرتے ہیں۔ اس کا رقبہ ایک ہزار ایکڑ ہے جس میں سے باغ صرف ۳۵۰ ایکڑ پر ہے، باقی حصہ کاشت اور سروس کے لیے ہے۔

آج شباہت صاحب کے ساتھ سفاری پارک دیکھنے گئے جو گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ سولہ ڈالر فی کس ٹکٹ تھا۔ کسی سفاری پارک دیکھنے کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا اور عجیب تجربہ تھا کہ آدمی قید اور جانور آزاد۔ گاڑیوں کے شیشے چڑھے ہوئے، اُترنا ممنوع، کہیں شترمرغ نے راستہ روک لیا، اب انتظار میں ہیں کہ یہ سڑک سے ہٹے تو گاڑی آگے بڑھے۔ ایک جگہ لمبے لمبے سفید سینگوں والے سرخ رنگ کے سندھی بیل سڑک پر جمع ہو گئے۔ پارک کا آدمی گاڑی میں بیٹھا کوڑا لئے آیا، اس نے بیلوں کو ہنکایا تب گاڑیاں آگے بڑھ سکیں۔ ببر شیر درختوں کے سایہ میں سوئے ہوئے۔ بندر گاڑیوں کی چھتوں اور شیشوں پر چڑھے ہوئے۔ ہم شیشے

چڑھائے، اے۔ سی چلائے گاڑی میں بیٹھے رہے۔ صہیب ولی محمد کے گانوں کا ریکارڈ لگا ہوا تھا: "راہِ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں"، "آج جانے کی ضد نہ کرو" وغیرہ۔ اس نے لطف کو دوبالا کر دیا۔ تقریباً دو گھنٹے گھوم کر گھر واپس آگئے۔

۱۱ر اگست ۱۹۸۶ء

صبح دس بجے نیویارک ایئرپورٹ سے بفیلو (Buffelo) کے لیے روانہ ہوئے۔ شباہت صاحب نے ایئرپورٹ پر پہنچایا۔ تقریباً سوا گیارہ بجے بفیلو پر اترے۔ ہمیں شام کو پونے پانچ بجے پھر نیویارک واپس آنا تھا اور وہاں سے ایک گھنٹے بعد دوسرے جہاز سے بوسٹن پہنچنا تھا، اس لیے ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے تھے جو ہم نیاگرا فال (آبشار) دیکھنے میں صرف کر سکتے تھے۔ اتنے کم وقت میں یہ سیر ٹیکسی کے بغیر ممکن نہ تھی، اس لیے نوے ڈالر میں ایک ٹیکسی طے کی اور بارہ بجے بفیلو سے نیاگرا فال کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں نیاگرا کے بعض جزیرے دیکھتے ہوئے فالز پر پہنچے اور خدا کی قدرت کا عجیب نظارہ سامنے آیا۔

دریائے نیاگرا ایری جھیل (Lake Erie) سے نکل کر اونٹاریو جھیل (Lake Ontario) میں گرتا ہے۔ یہ جھیلیں اتنی بڑی ہیں کہ ان میں جہاز رانی ہوتی ہے۔ دریائے نیاگرا ایک عظیم الشان دریا ہے۔ اس کا پاٹ کہیں کہیں دریائے سندھ سے بھی زیادہ چوڑا ہو جاتا ہے، لیکن پانی دریائے سندھ جیسا گدلا نہیں، بالکل شفاف ہے۔ یہ دریا فالز تک پہنچنے سے پہلے کئی جگہ نمایاں طور پر ریپڈوں کے ذریعہ پست ہوتا جاتا ہے، ورنہ اس کا فال اور بھی اونچا ہوتا۔ یہ دریا تین جگہ آبشار بناتا ہے: چھوٹا، اس سے بڑا اور نیم دائرے سے زیادہ گولائی میں اس سے بھی بڑا۔ مؤخر الذکر آبشار سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ امریکن سائڈ سے اس کا صرف نصف حصہ نظر آتا ہے۔ پورا آبشار اور اس کا مکمل حسن دیکھنا کینیڈا سائڈ جائے بغیر ممکن نہیں۔ اتنی بلندی سے پانی گرنے کی وجہ سے جو پانی اوپر اچھلتا ہے اور اس سے جو پھوار بلند ہوتی ہے وہ کئی میل دور سے نظر آتی ہے۔ اس فال کے قریب تک جانے کے لیے فیریز ملتی ہیں، امریکن سائڈ سے بھی اور کینیڈا سائڈ سے بھی۔ کینیڈا سائڈ سے جانے کے لئے لائن

بہت لمبی تھی، اس لیے کہ اس طرف سے نظارہ بہت خوبصورت ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ امریکن سائڈ سے کشتی لیں۔ چناں چہ کشتی میں بیٹھے۔ ہمیں رین کوٹ (برساتی) ملے، کیوں کہ پھوار جب نیچے گرتی ہے تو بارش کا منظر ہوتا ہے۔ کشتی کے ذریعہ کینیڈافال کے قریب تک پہنچے۔ بڑا حسین اور ہوشربا نظارہ تھا۔

اس سے فارغ ہو کر ہم پل پار کر کے کینیڈا کے علاقے میں داخل ہوئے۔ پاسپورٹ پر دخول کی مہر لگی۔ کہتے ہیں کہ کینیڈا امریکہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ پورے کینیڈا کا حال تو معلوم نہیں، اتنا ضرور ہے کہ اس کے ساحلی پارک اور وکٹوریہ پارک بہت خوبصورت ہیں اور ان پارکوں میں دلچسپیوں کے بہت سے سامان ہیں۔ ہم پارک سے گذرتے ہوئے مینولٹا ٹاور (Minolta Tower) پہنچے اور ٹاور کی بلندی سے فالز اور قرب وجوار کا دور دور تک کا نظارہ دیکھا۔ چوں کہ دن صاف تھا۔ اس لیے ٹاور پر سے ٹورنٹو کے ڈاؤن ٹاؤن کی بلند عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ٹاور سے اتر کر ہم کینیڈا کی ساحلی سڑک سے ایری جھیل پر پہنچے۔ دائیں جانب کینیڈا کی شاداب سرزمین، بائیں جانب نیاگرا کا شفاف پانی، ہماری گاڑی درمیان سے گذر رہی تھی۔ ہم نے ایری جھیل کے قریب سے پل پار کیا، اس طرح کہ دائیں جانب سمندر نما جھیل تھی، بائیں جانب اس کی کوکھ سے جنم لیتا ہوا دریائے نیاگرا۔ بفیلو کے ڈاؤن ٹاؤن سے گذرتے ہوئے ہم سوا چار بجے ایئرپورٹ پہنچے، وہاں سے روانہ ہو کر نیویارک آئے اور ایک گھنٹے بعد ہوسٹن کے لیے جہاز پر سوار ہو گئے۔ صبح سات بجے ٹرینٹن سے روانہ ہوئے تھے اور رات کو ساڑھے نو بجے ہوسٹن پہنچے۔ اس سے زیادہ مصروف دن اور کوئی نہیں گذرا۔ لیکن تفریح کے لحاظ سے یہ دن سب سے زیادہ شاندار تھا۔ نیاگرا فالز کے منظر کا اس سے پہلے کے دیکھے ہوئے مناظر سے کوئی مقابلہ نہیں۔

۱۵، ۱۶، ۱۷؍ اگست ۱۹۸۶ء

آج یہاں عید الاضحیٰ منائی گئی۔ اس بنیاد پر کہ سعودیہ میں بھی آج ہی عید ہے۔ یہ فیصلہ اسلامک سینٹر کا تھا اور یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت نے اسی پر عمل کیا۔ اسی تھامس البرٹ

ہال میں نماز ہوئی جس میں عید الفطر کی نماز پڑھی گئی تھی۔ تقریباً سات آٹھ ہزار کا مجمع تھا۔ میرے لڑکے اظہر بقا اور اس کے دوستوں نے بھی آج ہی عید منانے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے میں نے بھی سواد اعظم کے ساتھ آج عید کی نماز میں شرکت کی۔

اس کے مقابلے میں پاکستانیوں نے، جن کی قیادت مون مسٹ کی مسجد کے امام حافظ اقبال صاحب کرتے ہیں، سعودیہ کے بجائے مقامی رویت کا اعتبار کیا اور اس اعتبار سے عید ہفتے کے روز ہونی چاہیے تھی۔ چناں چہ انہوں نے اسلامک سینٹر کی مسجد میں ہفتے کے روز عید کی نماز پڑھی۔ اس میں اوسطاً پانچ چھ سو آدمیوں نے شرکت کی۔ چوں کہ میرے خیال میں انہی لوگون کا فیصلہ درست تھا، اس لیے میں نے ہفتے کو بھی عید کی نماز میں شرکت کی کہ اگر کل کی نماز نہ ہوئی ہو تو آج کی ہو جائے اور اگر ہو گئی ہو تو یہ نفل بن جائیں۔

حافظ اقبال صاحب اور بعض دوسرے حضرات نے مجھ سے نماز پڑھانے کے لیے کہا۔ میں نے اس بنیاد پر معذرت کر لی کہ ایک روز قبل پڑھ چکا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ نماز سے قبل کچھ تقریر ہی کر دیں، چناں چہ میں نے دس بارہ منٹ کی تقریر کی۔ قربانی کے متعلق تو بہت مختصر بات کہی، زیادہ تر چاند کے مسئلے پر اظہار خیال کرتا رہا۔

میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سعودی عربیہ کے اور ہوسٹن کے وقت میں جبکہ نو گھنٹے کا فرق ہے تو وہاں کی رویت کا یہاں کیسے اعتبار ہو گا۔

۱۷ اگست ۱۹۸۶ء

آج بارہ بجے کے قریب ہوسٹن سے اظہر اور فرید کی دو گاڑیوں میں روانہ ہوئے۔ پہلے سان مارکوس پہنچے، اس کے بعد آسٹن ہوتے ہوئے رات کو سوا گیارہ بجے ہوسٹن واپس آئے۔

سان مارکوس میں عجیب دنیا (Wonder World) کی سیر کی۔ ایک سو ساٹھ فٹ گہرا ایک غار دیکھا جو ۱۸۹۳ء میں دریافت ہوا۔ زلزلے کے اثر سے زمین کے اندر ہی اندر یہ غار بن گیا ہے۔ لاوے کے پتھروں کا غار ہے، چونے کے پتھروں کا نہیں۔ غار کی تہ میں

شفاف پانی کا ایک کنواں ہے۔ غار میں اترنے کے لیے سیڑھیاں بنادی گئی ہیں اور روشنی کا انتظام ہے۔ اس کے بعد لفٹ کے ذریعے ایک منارے پر چڑھے، جہاں سے دور دور تک کے اطراف کے سرسبز اور خوبصورت مناظر نظر آرہے تھے۔ اس کے بعد اس ایک کمرے میں داخل ہوئے جس میں زمین کی کشش کا اثر نہ تھا اور سہارے کے بغیر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ وہاں نل کا پانی نیچے سے اوپر کی طرف بہتا ہوا نظر آرہا تھا۔ یہ سب صرف ٹرِک تھا، حقیقت نہ تھی۔

۱۸ / اگست ۱۹۸۶ء

حافظ مولوی محمد اقبال صاحب جو مُون مسٹ کی مسجد میں امام ہیں، کا فون آیا کہ ہوسٹن کے اسلامک سینٹر میں امام کی جگہ خالی ہے۔ کمیٹی کے ایک ممبر نے دریافت کیا ہے کہ اگر مظہر بقا صاحب آمادہ ہوں تو میں بات کروں۔ میں نے کہا کہ مکہ چھوڑ کر میرے لیے کسی اور جگہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی دیر تک فون پر بات ہوتی رہی اور بالآخر میں نے کہا کہ اچھا آپ اسلامک سینٹر سے جامعہ ام القریٰ کو لکھوائیں کہ ایک سال کے لیے محمد مظہر بقا کی خدمات ہمیں دے دی جائیں، میں اُس وقت غور کروں گا۔

واشنگٹن کے اسلامک سینٹر کی مسجد میں امامت کے لیے بھی شامی صاحب کے توسط سے پیش کش ہوئی تھی اور میں نے انکار کر دیا تھا۔

تقریباً ڈھائی ماہ امریکہ میں قیام کے بعد ہم مکہ مکرمہ واپس آگئے۔

اس وقت جبکہ یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں (۱۵ / اپریل ۱۹۹۷ء) مجھے اور اہلیہ کو اظہر کے توسط سے امریکہ کا گرین کارڈ مل چکا ہے، اختر بھی ۱۲ / اگست ۱۹۹۷ء کو سعودیہ میں ملازمت ختم کر کے گرین کارڈ پر کینیڈا پہنچ چکا ہے اور میری سعودیہ کی ملازمت کا یہ آخری سال ہے۔

اللہ ہی کے علم میں ہے کہ جون ۱۹۹۷ء کے بعد زندگی کہاں گذرتی ہے، مکہ مکرمہ میں یا پاکستان یا امریکہ میں یا کینیڈا میں بشرطیکہ اس وقت تک زندہ رہا۔

ٹورنٹو (کینیڈا)

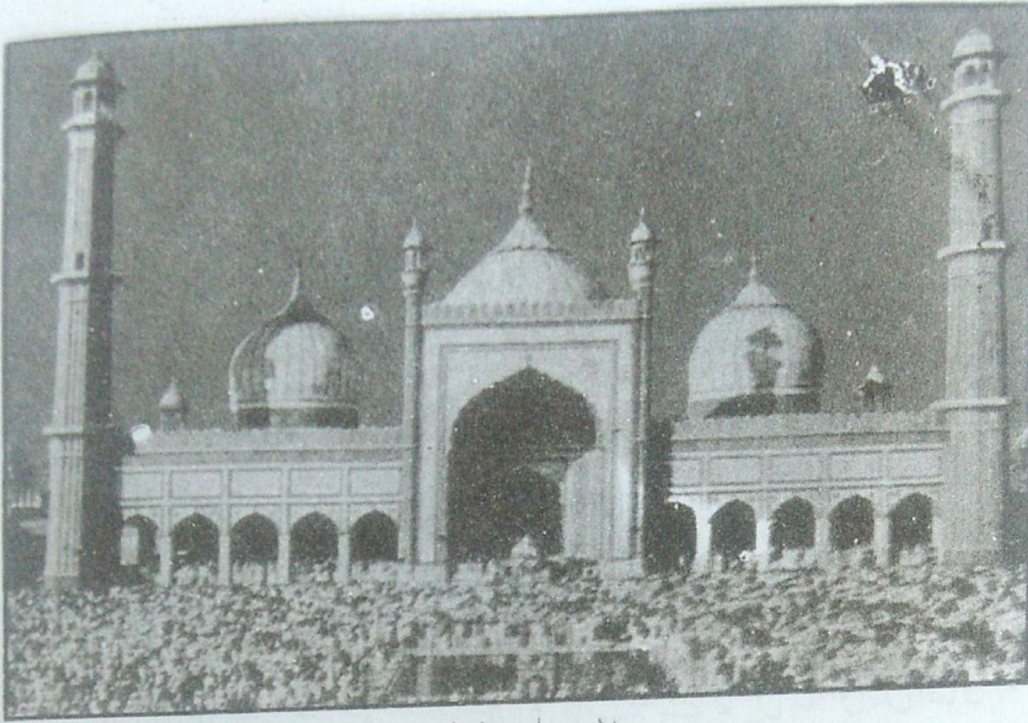
۱۳/ نومبر ۱۹۹۷ء کو تیسری بار اہلیہ کے ہمراہ ہوسٹن (امریکہ) پہنچا اور وہاں سے ۵/ دسمبر کو اختر بقا سلمہ کے پاس ٹورنٹو گیا، جو وہاں مستقلاً منتقل ہو چکا ہے۔

امریکہ میں جیسے جیسے جنوب سے شمال کی جانب بڑھتے جائیں شادابی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کینیڈا پہنچیں تو یہ شادابی اپنے شباب پر ہوتی ہے۔

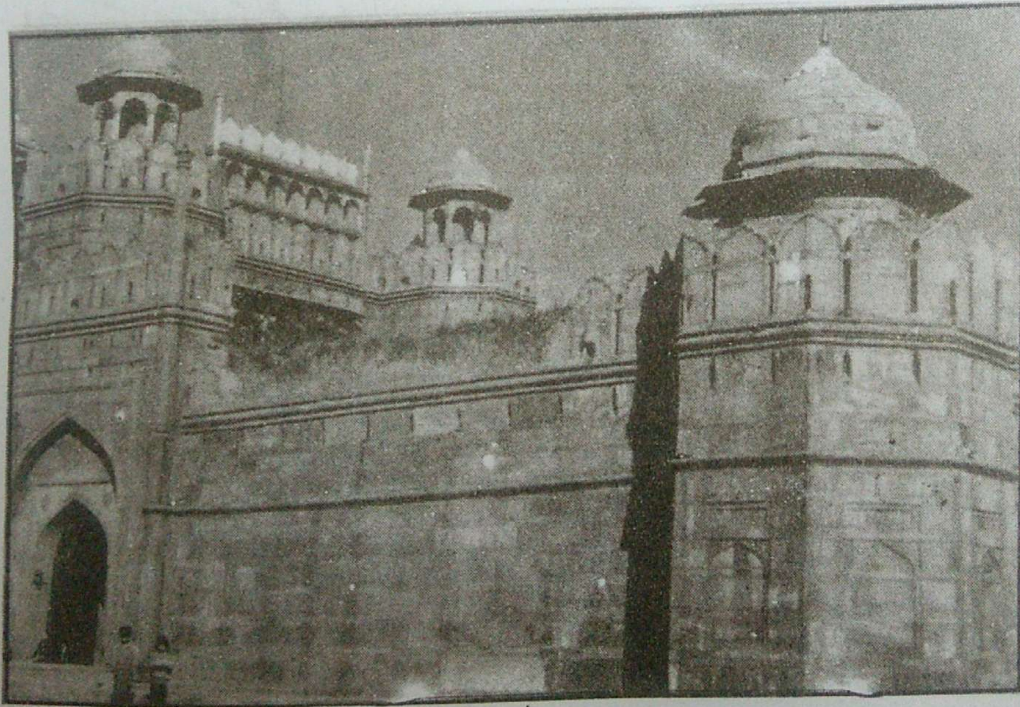
"ٹورنٹو" شہر "اونٹاریو" جھیل کے ساحل پر آباد ہے۔ قطب شمالی کی پگھلی ہوئی برف سے لبریز یہ سمندر نما جھیل اور اس کے ساتھ ساتھ آباد یہ وسیع و عریض خوبصورت شہر! ایسے حسین مناظر کم نظر آتے ہیں۔

ٹورنٹو میں ہمارا قیام صرف ایک ہفتہ رہا۔ سیاحت پسند طبیعت اور تفریح کے شوق کا تقاضا تھا کہ کوئی اور تفریحی یا تاریخی مقام بھی دیکھا جائے۔ نیاگرا فال پہلے دیکھ چکے تھے، اونٹاریو کا دل فریب منظر سامنے ہی تھا، لہٰذا ایک روز سی۔ این ٹاور (Canadian National Tower) دیکھنے کا پروگرام بنالیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ٹاور دنیا کی بلند ترین عمارت ہے اور اسی لیے دنیا کے عجائبات میں سے شمار ہوتی ہے۔

اس ٹاور کی کافی بلندی پر ایک جگہ موٹے شیشوں کا فرش بنا ہوا ہے جس سے نیچے کا منظر نظر آتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ گاڑیاں بچوں کے کھلونوں جیسی نظر آرہی تھیں اور آدمی بونے۔



انڈیا، دہلی، جامع مسجد



انڈیا، دہلی، لال قلعہ

ہندوستان کا آخری سفر

ہندوستان کے صوبے ""مدھیہ پردیش"" میں ""بھوپال"" سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر اوسطاً پچاس ہزار کی آبادی کا ""سرونج"" نامی ایک قصبہ ہے۔ میں اور میری اہلیہ اسی قصبے میں پیدا ہوئے اور اب تک ہمارے بیشتر اعزہ وہیں مقیم ہیں۔

سات سال بعد ۶/ اگست ۱۹۹۸ء کو ہم ""سرونج"" پہنچے۔ برسات کا موسم آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ ساون کی ایک ایک ہفتے تک جاری رہنے والی جھڑیاں اور کوئلوں اور پپیہوں کی فردوس گوش آوازیں اگرچہ بند ہو چکی تھیں، تاہم گاہے گاہے تیز بارش اور بیشتر ہلکی ہلکی پھوار کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ آبادی سے باہر کا پورا میدانی اور پہاڑی علاقہ جنت نظیر بنا ہوا تھا۔ خاص طور سے باب فرید کی پہاڑی اور اس کے اطراف کے منظر کہ حدِ نظر تک سرسبزی و شادابی ہے اور اس کے درمیان پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا وسیع و عریض بند اور اس کا لہریں لیتا ہوا شفاف پانی۔

بیرونی حسین مناظر کے ساتھ ساتھ اندرون شہر لوگوں کی بے پناہ محبت، بکثرت آمدورفت اور عصر کے بعد سے مغرب تک کی مسلسل نشست کی وجہ سے مجھے سرونج کے پچیس روزہ قیام میں وہ آرام نہ مل سکا جس کا میں ملازمت کے اختتام کے بعد سے عادی ہو چکا ہوں۔

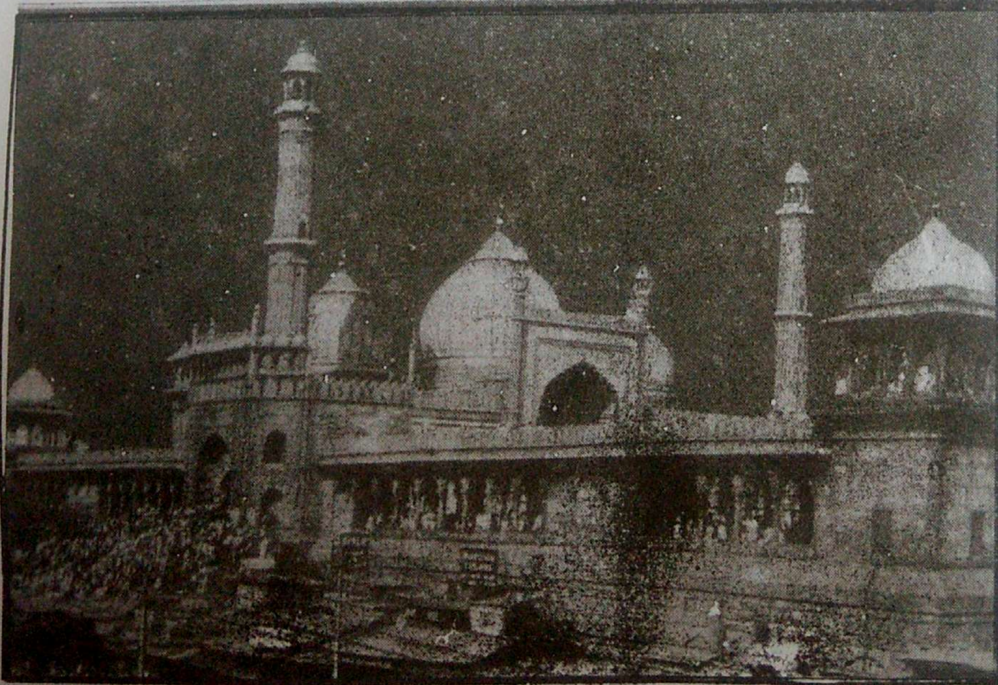
دعوتوں کی کثرت، پیٹ اور صحت کے لیے وبال بن گئی تھی، پھر جب دستر خوان پر تیتر، طاؤس، خرگوش اور ہرن کا گوشت ہو یا مرغوب دیہاتی غذائیں؛ باٹیاں، مسور کی دال اور

میری تو انسان احتیاط برتے بھی کیسے۔ بعض اوقات تو مجھے سورۂ "قریش" یا "الليلة الليلة عيدی يا كرشی ورضی الله عن سيدی ابی عبد الله القرشی" پڑھ کر ہاتھوں پر دم کر کے پیٹ پر پھرنا پڑتا تھا۔

علامہ دمیری نے حیاۃ الحیوان میں لکھا ہے کہ اس عمل سے کھانے کا ضرر ختم ہو جاتا ہے، بد ہضمی نہیں ہوتی۔

سرونج کے مدرسۂ ریاض المدارس کے طفیل اور تبلیغی جماعت کے اثرات سے میں نے یہاں کے مسلمانوں میں اتنی مذہبیت دیکھی کہ بہ حیثیتِ مجموعی اتنی مذہبیت کہیں اور دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پرانی مسجدوں کی توسیع، مدرسوں کے نام سے نئی مسجدوں کی تعمیر اور ان میں نمازیوں کی کثرت، وہ بھی جوانوں کی، یہ کیفیت میرے لیے حیرت کا باعث بھی تھی اور خوشی کا مقام بھی۔

اس مرتبہ سرونج میں ایک عجیب شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ "حبیب انور" ان کا نام ہے اور سرونج کے ایک مضافاتی دیہات "باموری شالا" کے رہنے والے ہیں۔ قد مائل بہ پستی، جسم لاغر و نحیف، لیکن اس جسم میں اللہ نے شیر جیسا دل ودیعت کیا ہے۔ جوانی کے

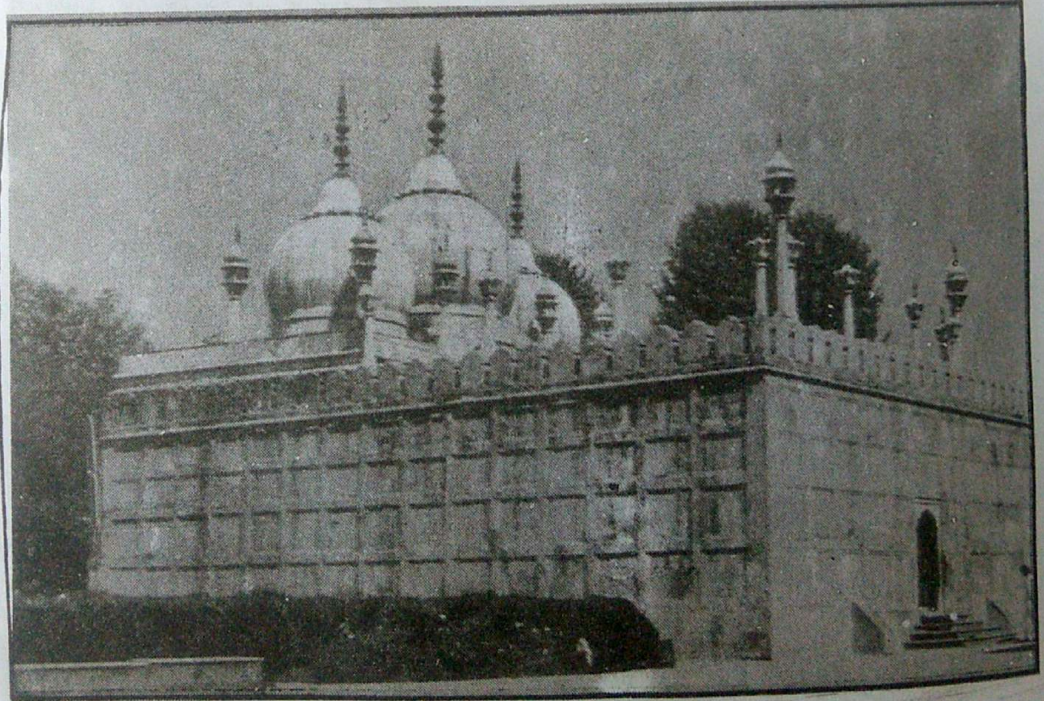


انڈیا، دہلی، جامع مسجد

زمانے میں شیروں کا شکار اور ان کے بچوں کو پکڑنا ان کا مشغلہ تھا۔ موصوف نے بتایا کہ میں نے سترہ شیر مارے اور بائیس بچے پکڑ کر کلکتہ لے جا کر فی جوڑا آٹھ سو روپے میں فروخت کیے۔

میں نے دریافت کیا کہ اس شغل میں کیا آپ کو خطرناک مواقع بھی پیش آئے؟ جواب دیا کہ دوبار؛ ایک مرتبہ میں بچے پکڑنے کے لیے جھاڑی میں داخل ہوا کہ شیرنی آگئی لیکن اندر آنے کے بجائے جھاڑی کے منہ پر بیٹھ گئی اس طرح کہ اس کا منہ جنگل کی جانب تھا اور دم جھاڑی کی جانب، مجھے اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ رینگتا ہوا شیرنی کی طرف تھوڑا سا کھسکا اور زور سے اس کی دم پکڑلی۔ شیرنی نے اس ناگہانی آفت سے ایک جست لگائی، میں بھی جھٹکے سے باہر آپڑا۔ شیرنی جنگل کی طرف بھاگی اور میں دونوں بچوں کو لکڑی کے کھوکے میں رکھ ، لے آیا۔

ایک بار میں پستی سے ایک بلند ٹیلے کی طرف چڑھ رہا تھا۔ میرے چند شکاری دوست نیچے سے بہت اوپر ایک پہاڑی پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے آواز دی کہ اوپر مت آنا، ٹیلے پر شیرنی بیٹھی ہے۔ میں نے پروا نہ کی۔ میرا سر جیسے ہی اوپر آیا، سامنے شیرنی تھی۔ اس نے فوراً میرے اوپر جست لگائی اور میں نے گردن نیچے کرلی۔ شیرنی نشیب میں گری اور میرے

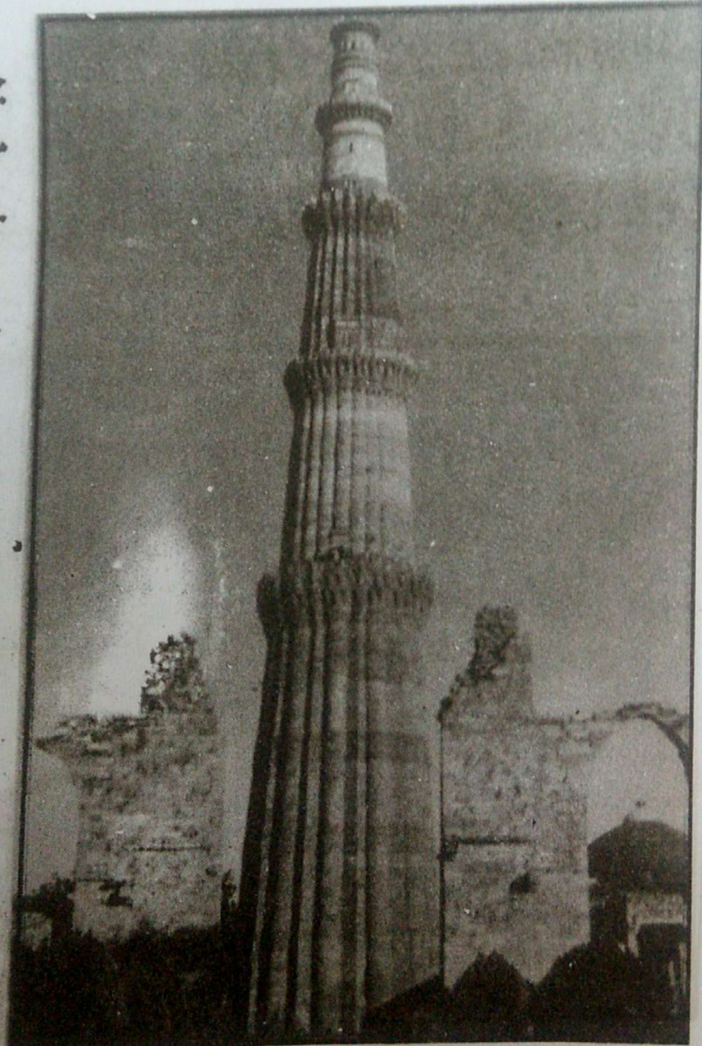


انڈیا، دہلی، پرل مسجد، لال قلعہ

ساتھیوں نے بندوقیں چلانی شروع کردیں۔ شیرنی بھاگ گئی۔

میں ۱۹۹۱ء سے اعصاب شکنی کے جس مرض میں مبتلا ہوں اس کے نتیجے میں دائیں آنکھ کا پپوٹا لٹک گیا ہے۔ پپوٹے کے آپریشن کے لئے سرونج سے اپنے بھانجے ڈاکٹر فرید اقبال زبیری کے پاس لکھنو گیا، لیکن آپریشن نہ ہو سکا۔ لکھنو کے بارہ روزہ قیام کے دوران مولانا تھانوی کے خلیفہ مولانا ابرار الحق کی زیارت کے لئے ہردوئی گیا اور واپسی میں گنج مراد آباد پہنچ کر مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم کے مزار پر فاتحہ خوانی کا موقع بھی نصیب ہوا۔

ملیح آباد بھی جانا ہوا، لیکن ایسے وقت میں جب کہ مشہور دسہری آموں کے درخت سونے پڑ چکے تھے۔


انڈیا، دہلی، قطب مینار

کاکوری بھی دیکھا جہاں اس اطراف کے مشہور بزرگ تراب علی شاہ قلندر اور ان کے آباء و ابناء کے مزارات ہیں۔

لکھنو کی مشہور تاریخی عمارات اور خاص طور پر دونوں امام باڑے بھی دیکھے۔ ایک زمانے میں ان عمارتوں کی کیا شان و شوکت ہو گی، لیکن آج مسلمانوں میں اتنی سکت بھی نہیں کہ ان پر چڑھی ہوئی کائی بھی صاف کرا سکیں۔

کسری اور افراسیاب کے محلات کا ذکر ایک شاعر نے ان الفاظ میں کیا ہے :

پردہ داری می کند در کاخ کسری عنکبوت

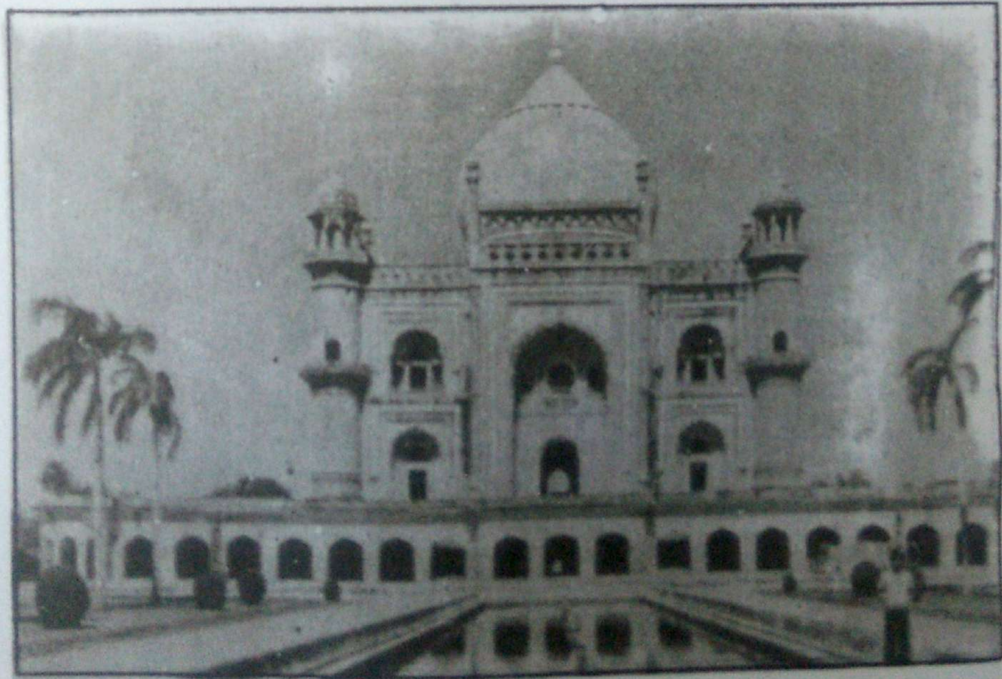
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

(کسری کے محل میں (ریشم و کمخواب کے بجائے) مکڑیوں کے جالوں کے پردے لٹکے ہوئے ہیں اور افراسیاب کے گنبد پر الو نوبت بجا رہا ہے)۔

تو ان محلات کے مقابلے میں لکھنو کی ان تاریخی عمارتوں کی کیا حیثیت۔

لکھنو سے ۱۶ر ستمبر کو دلی آیا، جہاں سے کراچی کے لئے ہوائی جہاز میں سوار ہونا تھا۔ دلی میں چند گھنٹے بستی نظام الدین میں قیام رہا۔ مزارِ اقدس پر دوسری بدعات کے ساتھ سجدوں کی کثرت بھی دیکھی اور مزار کے قرب میں بدعت سے مجتنب تبلیغی جماعت کا مرکز بھی دیکھا۔

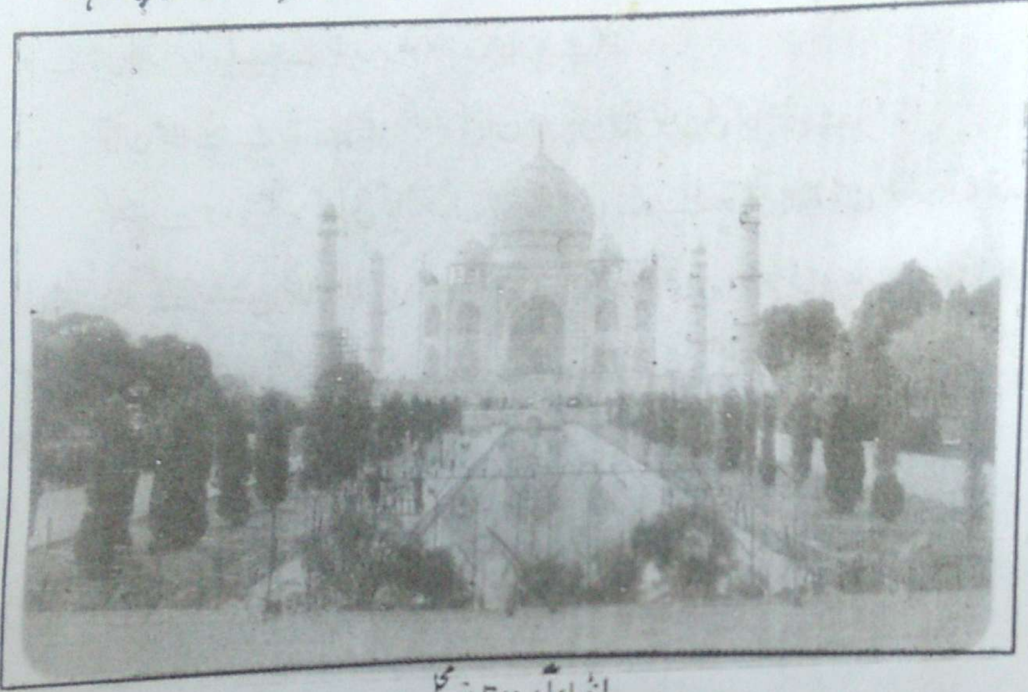
سنت وبدعت کے پہلو بہ پہلو مراکز اور وہ بھی اس طرح کہ "بینهما برزخ لا یبغیان" (ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے کہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے)۔



انڈیا، دہلی، صفدر جنگ کا مقبرہ

بالآخر ہندوستان کا ریلوں اور ناہموار سڑکوں پر موٹروں کا یہ تکلیف دہ سفر، جس کا میں برسوں سے عادی نہیں رہا، ۱۶ر ستمبر کو ختم ہوا۔

ہندوستان کا سفر بظاہر آخری سفر ہے کیونکہ صحت اب اس طرح کے سفروں کی متحمل نہیں رہی، جبکہ عمر بھی ۶۷ سال کی ہو چکی ہے اور سفینۂ حیات بھی لبِ ساحل پہنچ چکا ہے۔



انڈیا، آگرہ، تاج محل



انـ ہو ـ ہما ـ ں کا ـ ہ



بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز

کراچی